جلد ۱۱ شمارہ ۵ مئی ۱۹۹۹ء محرم ۱۴۲۰ھ

فہرست

اس شمارے میں		
اس شمارے میں	محمد بلال	۲
شذرات		
”ربا“ کی ممانعت ـــ سپریم کورٹ کے سوال	معز امجد / محمد بلال	۴
قرآنیات		
البیان: البقرہ ۲: ۳۰-۳۳ (۷)	جاوید احمد غامدی	۱۸
معارف نبوی		
زمانہ اور خدا	طالب محسن	۲۳
صبر خداوندی	طالب محسن	۲۶
دین و دانش		
قانون دعوت (۲)	جاوید احمد غامدی	۲۹
التزام جماعت ـــ اعتراضات کا جائزہ (۵)	معز امجد	۳۷
دانش سرا کی سرگرمیاں		
دانش سرا، پاکستان کا دوسرا سالانہ اجتماع (۱) (جاوید احمد صاحب غامدی کی افتتاحی تقریر)	محمد بلال	۴۳
یسئلون		
متفرق سوالات	طالب محسن	۵۱
مدیر کے نام		
ایک روایت پر اعتراض	ابو سلمان / معز امجد	۵۵
ملاقات		
احمد جاوید صاحب سے ایک مکالمہ	نعیم احمد بلوچ	۵۸
ادبیات		
چیزیں اور جذبے (افسانہ)	محمد بلال	۶۹
غزل	جاوید احمد غامدی	۷۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس شمارے میں

ہمارے معاشرے میں جب کسی عالمِ دین کے بارے میں یہ بات کی جائے کہ یہ صاحب دروس و محاضرات کا اہتمام کررہے ہیں۔ اپنے شاگردوں کو تیار کررہے ہیں۔ لوگوں کی اخلاقی تربیت کررہے ہیں۔ دینی موضوعات پر کتابیں تصنیف کررہے ہیں تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ عالمِ دین ایک ''بے عمل'' عالمِ دین ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ''باعمل'' عالمِ دین تو وہ ہے جو سیاست کے میدان میں اترا ہوا ہے۔ جو آئے روز ریلیاں منعقد کررہا ہے۔ جو لوگوں کو سڑکوں پر لا رہا ہے۔ جو ایوانِ اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا اعلان کررہا ہے۔ جو حکمرانوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو للکار رہا ہے۔ جو اس نظامِ حکومت کو چند دنوں میں جڑ سے اکھیڑ کر چند دنوں میں اسلامی نظام لانے کی نوید سنا رہا ہے۔ یا وہ عالمِ دین حقیقی عالمِ دین ہے جو ملکی نظام کی تبدیلی کے لیے جہاد و قتال کی راہ دکھا رہا ہے۔ لوگوں کو ڈنڈے کے زور پر درست کرنے کی بات کررہا ہے۔ اور اس ''مشن'' کی تکمیل کے لیے ''فدائی'' اور ''فوجی'' بھرتی کررہا ہے۔ یعنی عالمِ دین کے حوالے سے لوگوں کے ذہنوں میں اصلاً کسی دنیوی فلاح کا تصور ابھرتا ہے۔ اس تصور کے نہ صرف عام لوگ بلکہ بہت سے علمائے دین بھی قائل نظر آتے ہیں۔

اس وقت ''دین و دانش'' میں جاوید احمد صاحب غامدی کی ایک تحریر ''علما کا انذار'' کے ذیلی عنوان کے تحت شائع کی گئی ہے۔ اس تحریر میں جاوید صاحب نے علمائے دین کے اصل کام کے پہلو سے قرآن کی ایک نص کی وضاحت کی ہے۔ عالمِ دین کو ایک سیاسی انقلابی آدمی سمجھنے والوں کے لیے اس تحریر میں ہدایت کا بہت سامان ہے۔

اسی طرح ''دانش سرا کی سرگرمیاں'' کے ضمن میں دانش سرا، پاکستان کے دوسرے سالانہ اجتماع کی رپورتاژ تحریر کی گئی ہے۔ اس قسط میں جاوید احمد صاحب غامدی کی افتتاحی تقریر مرتب کی گئی۔ اس تقریر کے پس منظر میں بھی مذکورہ مسئلے کی سنگینی پوری طرح موجود ہے۔

''دین و دانش'' کے ذیل میں جاوید احمد صاحب غامدی کا سلسلہ ''اصول و مبادی'' بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس اشاعت میں اس کی قسط کا اہتمام نہیں کیا جا سکا۔ دراصل اس ماہ جاوید صاحب حجِ بیت اللہ

کی سعادت حاصل کرنے گئے تھے۔ وہاں ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد بھی طبیعت سنبھلنے میں کچھ دن لگ گئے، جس کی وجہ سے وہ یہ تحریر نہ لکھ سکے۔

''ملاقات'' کے ضمن میں احمد جاوید صاحب سے ایک مکالمہ طبع کیا گیا ہے۔ اس مکالمے میں قارئینِ ''اشراق'' کو ایسی باتیں بھی پڑھنے کو ملیں گی جو ہمارے طرزِ فکر سے مختلف ہوں گی۔ اس صورتِ حال میں ہمارے بعض قارئین جھنجلا جاتے ہیں۔ اختلافی امور سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ایک پہلو سے دیکھیں تو اختلافی امور اپنے اندر بہت سے افادی پہلو رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان قارئین سے ہماری یہ درخواست ہے کہ مذکورہ صورتِ حال میں مسائل کے جو نئے پہلو ان کے سامنے آئیں ان پر وہ سنجیدگی اور غیر جانبداری سے غور کریں۔ اپنی قائم شدہ آرا کو از سرِ نو پرکھیں۔ اس تحقیق، تنقید اور تنقیح سے دو میں سے ایک نتیجہ ضرور نکلے گا۔ یا انھیں یہ احساس ہو جائے گا کہ جو نقطۂ نظر انھوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یا جس نقطۂ نظر کے وہ حامل ہیں اس کی صحت پر ان کا ایمان مزید مضبوط ہو جائے گا۔ یعنی دونوں صورتوں میں انھی کا فائدہ ہو گا۔

زندگی میں روز و شب بہت سے واقعات پیش آتے ہیں۔ یہ واقعات ہمارے لیے ایک تجربہ بن جاتے ہیں۔ ان واقعات کا مخصوص رنگ، ان کا نفسیاتی تاثر اور کسی حقیقت کی دریافت ایک لکھنے والے کو قلم اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ قلم اٹھاتا ہے اور اس طرح کے واقعات کو سادگی سے بیان کر دیتا ہے۔ ایک ایسے ہی واقعے کو ''چیزیں اور جذبے'' کے نام سے ایک افسانہ کے قالب میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ بھی ''ادبیات'' کے ذیل میں شاملِ اشاعت ہے۔

اس کے علاوہ ''شذرات''، ''قرآنیات''، ''معارفِ نبوی'' اور ''یسئلون'' کے سلسلے حسبِ روایت موجود ہیں۔

—— محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

"ربا" کا خاتمہ —— سپریم کورٹ کے سوالات

پچھلے دنوں سپریم کورٹ آف پاکستان نے وطنِ عزیز میں سود کے خاتمے کے ضمن میں ایک سوال نامہ جاری کیا۔ میں نے بھی اپنی بساط کے مطابق اس کا جواب لکھ کر ارسال کیا۔

اب قارئینِ "اشراق" کے استفادے کے لیے محمد بلال صاحب نے اس انگریزی میں لکھے گئے خط کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ (مدیر)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۲۰ مارچ ۱۹۹۹ء

جناب رجسٹرار

سپریم کورٹ آف پاکستان

اسلام آباد

موضوع: سپریم کورٹ آف پاکستان کے سوال نامے کا جواب

جنابِ عالی،

میں "ربا" اور پاکستانی معیشت کو "ربا" سے پاک کرنے کے متعلق فاضل عدالت کی جانب سے پوچھے گئے سوالوں کے جواب ارسال کر رہا ہوں۔ اگر میرے کسی جواب کا کوئی پہلو تشنہ رہ جائے تو میں اس تشنگی کو دور کرنے اور اس کی مزید وضاحت کرنے کے لیے حاضر ہوں تاکہ "ربا" پر مبنی معیشت اور معاملات سے حکومتِ پاکستان کو نجات دلانے میں اپنا صحیح کردار ادا کر سکوں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی پسندیدہ راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مخلص

معز امجد

مدیر ماہنامہ ''اشراق'' (اردو)

۲۳ ای ماڈل ٹاؤن لاہور۔

پہلا سوال

قرآنِ مجید نے ''ربا'' کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس اصطلاح کا کیا مطلب ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں آپ اس کی کیا تعریف اور تعبیر کریں گے؟

جواب

لفظ ''ربا'' کا مفہوم متعین کرنے کے معاملے میں یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ قرآنِ مجید نے لفظ ''ربا'' اصطلاحی نہیں بلکہ سادہ لغوی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اگر یہ لفظ قرآن میں بطور اصطلاح کے استعمال کیا گیا ہوتا تو یہ ضروری تھا کہ اس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے قرآن مجید ہی کو بنیاد بنایا جاتا۔ چونکہ یہ لفظ اپنے سادہ لغوی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے اس لیے اس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے قرآنِ مجید ہی پر انحصار ضروری نہیں رہا ہے۔ لہٰذا ہم اس کے لیے وہی طریق کار اختیار کریں گے جو کسی بھی زبان کے کسی بھی لفظ کا مفہوم متعین کرنے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔

فاضل عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ ''ربا'' کی تعریف اور تعبیر قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کی جائے۔ یہ تقاضا اسی صورت میں پورا کیا جا سکتا تھا اگر ''ربا'' کا لفظ قرآن میں لغوی کے بجائے اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہوتا یا قرآن و حدیث میں عربی الفاظ کے معنی بیان کرنے والے الگ ابواب بھی قائم کیے گئے ہوتے۔ قرآن نے یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس لیے میں اپنی تحقیقات کی بنیاد مستند لغات اور عربی زبان کے دوسرے ماخذوں ہی پر رکھوں گا۔

عربی فعل ''ربا''، ''یربو'' کا اکثر عربی لغات میں حسبِ ذیل لغوی مفہوم بیان کیا جاتا ہے:

ا۔ 'زادو نما' (بڑھنا۔ نشو و نما پانا)

اسم ''ربا'' یا ''الربا'' جو قرآن میں عام طور پر استعمال ہوا ہے اس کے معنی سب سے مستند اور معروف عربی لغت ''اقرب الموارد'' میں 'العینة..... والفضل' بیان کیے گئے ہیں:

یعنی لفظ ''ربا'' یا ''الربا'' بطور اسم حسبِ ذیل دو مفاہیم کا حامل ہے:

ا۔ اضافہ۔ ۲۔ العینة۔

''اقرب الموارد'' لفظ ''عین'' کے تحت ''بیع العینة'' کے حسبِ ذیل معنی بیان کرتا ہے:

''ایک شخص دوسرے شخص سے قرض مانگتا ہے اب چونکہ قرض کی رقم سے کچھ زائد رقم وصول کرنا ممنوع ہے اس لیے قرض دینے والا قرض دینے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ لٰہذا وہ قرض مانگنے والے سے کہتا ہے کہ میں تمھیں یہ کپڑا بارہ درہم میں ادھار ایک خاص مدت کے لیے دیتا ہوں، جبکہ اس کپڑے کی اصل قیمت دس درہم تھی۔ پھر قرض خواہ قرض دار سے دو درہم زائد اس مخصوص مدت کے لیے وصول کرتا ہے۔ (یہ دو درہم ''ربا'' ہی ہیں)۔''

یہاں اس بات کی وضاحت بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ لفظ ''ربا'' اور ''الربا'' کے مطلب اور تعبیر میں وقت کے ساتھ کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اس لفظ کا مطلب جدید عربی لغات میں حسبِ ذیل بیان کیا جاتا ہے:

''الراید'' کے مطابق:

''ا۔ زائد (مثلاً زائد رقم) یا اضافہ۔

۲۔ قرض کے اوپر کوئی وصولی۔''

''لاروس'' کے مطابق:

''ا۔ زائد (مثلاً زائد رقم)، وصولی یا منافع جو قرض دینے والا قرض پر وصول کرتا ہے۔ معاشیات کی اصطلاح میں) وہ رقم جو قرض کی رقم لینے والا قرض کے علاوہ کچھ مخصوص شرائط (مثلاً مدت اور شرح کے تعین) پر ادا کرتا ہے۔''

اسی نوعیت کا مطلب ''المعجم الوسیط'' میں بیان کیا گیا ہے۔

اوپر درج ''ربا'' کے مطالب کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ (''اقرب الموارد''، ''لاروس'' اور

''المعجم الوسیط'' میں بتائے گئے مفہوم کی بنیاد پر) لفظ ''ربا'' کے معنی یہ ہیں:

۱۔ کوئی اضافہ۔

۲۔ قرض پر مدت اور شرح کے پیشگی تعین کی شرائط کے ساتھ لیا جانے والا اضافہ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں ''ربا'' کا لفظ ان دونوں مفاہیم میں کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ ''ربا'' سے متعلق آیات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بڑے قطعی انداز سے کہی جا سکتی ہے کہ اوپر مذکور دونوں مطالب میں سے قرآن کے پیشِ نظر دوسرا مطلب ہے۔ ہماری اس ترجیح کی حسبِ ذیل وجوہ ہیں:

۱۔ اگر قرآن نے یہ لفظ محض ''اضافہ'' کے مفہوم میں استعمال کیا ہوتا تو ''اضافہ'' کا ہر قسم کے کاروبار پر بھی اطلاق ہوتا۔ لیکن قرآن کے الفاظ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ قرآن کی ان آیات میں لفظ ''ربا'' میں اس قسم کے ''اضافہ'' کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ قرآن کہتا ہے:

قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا. (البقرہ ۲:۲۷۵)

''وہ کہتے ہیں: تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا: اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا اور ربا سے منع کیا ہے۔''

ان جملوں سے صاف واضح ہے کہ کسی کاروبار سے حاصل ہونے والا ''اضافہ'' (نفع) ''ربا'' نہیں ہے۔

۲۔ مزید دیکھیے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ. (۲:۲۷۹)

''اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمھیں حق ہے۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمھارا حق مارا جائے۔''

اس آیت نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ یہاں ''ربا'' سے مراد خاص وہ اضافہ ہے جس کا مطالبہ قرض دینے والا مقروض سے کرتا ہے۔

۳۔ اس کے بعد غور کریں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ ۲:۲۸۰)

''اور اگر (مقروض) تنگ دست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو اور بخش دو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔''

اس تفصیل سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ قرآن نے ''ربا'' کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال کیا

ہے جس مفہوم میں انگریزی زبان میں (قرض کے اوپر) انٹرسٹ (Interest) اور اردو زبان میں 'سود' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

دوسرا سوال

''ربا'' کے اطلاق کا دائرہ کیا ہے ؟ کیا ''ربا'' کی اصطلاح کا اطلاق بنکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے انٹرسٹ پر حاصل کیے گئے تجارتی اور پیداواری قرضوں پر بھی ہوتا ہے ؟

جواب

پہلے سوال کے جواب سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ لفظ ''ربا'' کے اطلاق میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ وہ ''ربا'' پر لیا گیا قرض ذاتی (غیر کاروباری) مقاصد کے لیے ہے یا کاروباری مقاصد کے لیے۔ قرآن کی رو سے ''ربا'' ممنوع ہے خواہ وہ ذاتی استعمال کے قرض پر لیا جائے یا کاروباری استعمال کے قرض پر۔

اگر کوئی شخص اس نقطۂ نظر کا حامل ہے کہ ''ربا'' سے متعلق قرآنی آیات ذاتی قرض سے متعلق ہیں تو اس صورت میں یہ بات ثابت کرنے کی ذمہ داری محض اس شخص پر ہو گی جو شخص یہ بات کہتا ہے، اور اس ضمن میں وہی دلیل قابل قبول ہو گی جس میں کلاسیکی عربی زبان سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ ''ربا'' کا لفظ صرف ذاتی (غیر کاروباری) قرضوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یا یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن میں جہاں یہ حکم بیان ہوا ہے اس کا سیاق و سباق اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ''ربا'' کے مفہوم میں کاروباری قرض بھی شامل کیا جائے۔ اگر کوئی ایسی دلیل یا کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے تو پھر ''ربا'' کو غیر کاروباری قرض کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

یہ بات سورۂ روم کی ایک آیت سے مزید مستحکم ہو جاتی ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت لوگ تجارتی قرض پر سود دیا کرتے تھے۔ ملاحظہ فرمایئے وہ آیت:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ. (۳۰:۳۹)

''اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ دوسرے کے مال کے اندر پروان چڑھے تو اللہ کے ہاں پروان نہیں چڑھتا اور جو تم زکوٰۃ دو گے اللہ کی رضا جوئی کے لیے یہی لوگ ہیں جو اللہ کے ہاں

اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔''

اس آیت کے ان الفاظ ''اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ دوسروں کے مال کے اندر پروان چڑھے'' سے واضح ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت ذاتی قرضوں کے علاوہ تجارتی قرضے بھی دیے جارہے تھے۔ لہٰذا اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ''ربا'' کی ممانعت کے دائرے میں غیر کاروباری اور کاروباری ہر قسم کا قرض آتا ہے۔ اور اس طرح قرآن کی متعلقہ آیات کا اطلاق بنکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے حاصل کیے گئے ان تمام قرضوں پر ہوتا ہے جن پر سود وصول کیا جاتا ہے۔

تیسرا سوال

پاکستانی بنک اور کچھ دوسرے مالیاتی ادارے مارک اپ (Markup) کے اوپر بائی بیک (Buy Back) کی بنیاد پر اپنے کلائنٹ کی سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ اس طریق کار میں بنک کے کلائنٹ کا منشا ہوتا ہے کہ وہ کوئی مخصوص جنسِ تجارت بنک کو فروخت کرے اور اسی طرح زیادہ قیمت پر اقساط میں ادائیگی کی بنیاد پر اسے دوبارہ خریدے۔ مارک اپ کی ایک خاص (مثلاً سالانہ) شرح کا مذکورہ دوسری فروخت پر اطلاق ہوتا ہے۔ کیا یہ معاملہ ''ربا'' کے تحت آتا ہے؟

جواب

جیسا کہ میں نے پہلے سوال کے جواب میں عرض کیا اس قسم کا معاملہ 'بیع العینة' یا 'العینة' کہلاتا ہے۔ یہ معاملہ بھی اس سود پر حاصل کئے گئے قرض سے مشابہ ہے جو ''اقرب الموارد'' میں ''ربا'' کی اصل تعریف کے ضمن میں بیان کیا گیا۔ یہ معاملہ بھی حسبِ ذیل دو خصوصیات کے جمع ہو جانے کے باعث ''ربا'' ہی کے تحت آتا ہے:

۱۔ ادھار فروخت پر ایسا منافع لینا جو نقد پر فروخت کے منافع کے علاوہ ہے۔

۲۔ مارک اپ (Markup) کی ایک خاص (مثلاً سالانہ) شرح کا مذکورہ دوسری فروخت پر اطلاق ہونا۔

ان دونوں خصوصیات کے جمع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرض (ادھار فروخت) پر پیشگی ایک شرط (مارک اپ کی ایک شرح) طے کی گئی ہے، جس کا قرض دینے والا قرض لینے والے سے اس بات پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس مالی اثاثے کو ایک خاص وقت (مثلاً ایک سال) تک استعمال کرے۔ میرے پہلے سوال کے جواب کے مطابق یہ معاملہ سرتاسر ''ربا'' کے تحت آتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

چوتھا سوال

کیا ''ربا'' کی ممانعت کے حوالے سے مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق ہے؟ کیا ''ربا'' کی ممانعت کے دائرے میں وہ قرضے بھی آتے ہیں جو غیر مسلموں سے حاصل کیے جاتے ہیں یا ان مسلم ممالک سے لیے جاتے ہیں جن کے قوانین اور پالیسیاں بین الاقوامی مالی قوانین اور پالیسیوں کے مطابق ہیں اور جن پر پاکستان کی ریاست کا کنڑول نہیں ہے؟

جواب

قرآنِ مجید سے یہ بات بالکل قطعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست کسی شخص کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ''ربا'' لینے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس معاملے میں ایک اسلامی ریاست میں مسلمان اور غیر مسلم، شہری میں بالکل کوئی فرق روا نہیں رکھا جا سکتا۔

یہاں یہ بات بھی بہت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ریاستِ پاکستان یا کوئی اور مسلم ریاست جب افراد کے حوالے سے ''ربا'' پر پابندی لگائے گی تو اس میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ اسی طرح وہ تمام ادارے خواہ مسلمانوں کے ہوں یا غیر مسلموں کے اگر ریاست کے دائرۂ اختیار (Jurisdiction) میں آتے ہیں، ان میں بھی اس ضمن میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن در حقیقت ''ربا'' لینے سے منع کرتا ہے، ''ربا'' دینے کی ممانعت احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آئی ہے جو در حقیقت ''ربا'' لینے ہی کی ممانعت کا ایک نتیجہ ہے۔ یعنی ''ربا'' لینے ہی کی ممانعت حقیقی اور بنیادی ممانعت کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ ایک باریک نکتہ ہے اس لیے ہم اس کی مزید تفصیل کرتے ہیں۔

جیسا کہ قرآنی آیات سے یہ واضح ہے اصل ممانعت ''ربا'' لینے سے متعلق ہے۔ قرآن کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جو ''ربا'' دینے سے منع کرتی ہو۔ اس کی وجہ سادہ ہے۔ قرآن کے نزدیک اصل اخلاقی خرابی، ناانصافی اور زیادتی ''ربا'' لینے ہی میں پائی جاتی ہے نہ کہ ''ربا'' دینے میں۔ قرآنِ مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرِ قیادت ریاستِ مدینہ کا اصل زور ''ربا'' لینے کے خاتمے پر ہے نہ کہ ''ربا'' دینے کے خاتمے پر۔ اس سارے عرصے کے دوران میں قرآن ''ربا'' لینے والوں کو اس سزا سے ڈراتا ہے جو انھیں قیامت کے دن بھگتنا پڑے گی۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ریاست کے حکمران کی حیثیت سے ''ربا'' لینے والوں کو الٹی میٹم دیا

کہ اگروہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے گا (البقرہ ۲: ۲۷۹)۔

اس دوران میں ایک آیت بھی ایسی نازل نہیں ہوئی جس نے لوگوں کو ''ربا'' دینے سے روکا ہو اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ''ربا'' دینے سے منع فرمایا۔ اس کے برعکس قرآن ''ربا'' دینے والے کو مقروض کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا، اس سے اصل رقم لینے کے سلسلے میں مناسب مہلت دینے کی ہدایت کرتا بلکہ بعض حالات میں اپنی رقم لینے ہی سے دست کش ہو جانے کی نصیحت کرتا ہے۔ اور یہ ترغیب دیتا ہے کہ اگروہ رقم مقروض کو انفاق کر دے تو اس کا صلہ وہ روزِ آخرت میں پائے گا۔

اس کے بعد جب دورِ نبوی کی ریاستِ مدینہ میں ''ربا'' لینا مکمل طور پر ختم ہو گیا اور کسی ایک شخص کو بھی ''ربا'' لینے کی اجازت نہ رہی معاشرہ اس برائی سے پاک ہو گیا اور ''ربا'' لینا ایک قابلِ سزا جرم قرار پا گیا، تب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ وہ لوگ جو ''ربا'' پر قرض دیتے ہیں یا جو خاموشی سے ''ربا'' دینے کی حامی بھرتے ہیں یا جو ''ربا'' کی دستاویز لکھتے ہیں یا جو اس دستاویز پر گواہ بنتے ہیں اور یہ معاملہ ریاست کے نوٹس میں نہیں لاتے تو انھوں نے ریاستی احکام کی خلاف ورزی کی ہے جس کی بنا پر یہ سب ملعون اور سزا کے مستحق ہیں۔

قرآنِ مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے یہ واضح ہوا کہ اصل جرم ''ربا'' لینا ہے جبکہ ''ربا'' دینا اس وقت جرم بنتا ہے جب معاشرہ ''ربا'' سے بالکل پاک ہو چکا ہو اور ''ربا'' دینا ریاست کی سطح پر ممنوع اور قابلِ سزا جرم قرار دیا جا چکا ہو۔

اب ہم وہ اقدامات بیان کرتے ہیں جو ''ربا'' کے خاتمے کے لیے ریاست کو ابتداً کرنے چاہییں:

۱۔ اپنی ریاستی حدود میں تمام شہریوں اور اداروں کو کسی شخص سے خواہ وہ ملک میں رہتا ہو یا دوسرے ملک میں مقیم ہو، ہر مالی معاملے میں ''ربا'' لینے سے منع کیا جائے۔

۲۔ اپنی ریاستی حدود میں تمام شہریوں اور اداروں کو کسی ادارے سے، خواہ وہ ادارہ ملکی ہو یا غیر ملکی اور خواہ وہ ادارہ ملکی حدود کے اندر کام کرتا ہو یا ان سے باہر، ہر قسم کے مالی معاملے میں ''ربا'' لینے سے منع کیا جائے۔

۳۔ کسی شخص سے، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی کسی مالی معاملے میں حکومت ''ربا'' لینے سے باز رہے۔

۴۔ کسی ادارے سے، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی اور خواہ وہ ملکی حدود میں کام کرتا ہو یا ان حدود سے باہر، ہر قسم کے مالی معاملے میں حکومت ''ربا'' لینے سے باز رہے۔

۵۔ کسی دوسرے ملک سے کسی قرض یا امداد پر ''ربا'' لینے سے اجتناب کیا جائے۔

۶۔ ریاست کے اندر رہنے والے اور ریاستی حدود میں کام کرنے والے ایسے ادارے جو ان پابندیوں کی خلاف ورزی کریں، ان کے خلاف قوانین بنائے جائیں اور انھیں سزا دی جائے۔

۷۔ ان شہریوں اور اداروں کے خلاف قوانین بنائے جائیں اور انھیں مجرم سمجھ کر سزا دی جائے جو ملکی حدود میں کسی مالی معاملے میں کسی دوسرے شہری اور ادارے کو ''ربا'' دینے پر راضی ہو جاتے ہیں اور یہ بات ریاست کے نوٹس میں نہیں لاتے۔

۸۔ ایسے ملکی شہریوں اور اداروں کو مجرم سمجھ کر ان کے خلاف قوانین بنائے جائیں اور ان پر سزا نافذ کی جائے جو کسی ''ربا'' پر مبنی دستاویز کو تحریر کرتے یا اس پر گواہ بنتے اور ایسے معاملے کو ریاست کے نوٹس میں نہیں لاتے۔

اس ضمن میں ''ربا'' کی ممانعت پر مبنی بنائے گئے قوانین پاکستان سے باہر کے ان لوگوں اور اداروں پر لاگو نہیں ہوں گے جو ''ربا'' پر قرض دیتے ہیں۔ اسی طرح، ملکی حدود کے باہر رہنے والے لوگوں یا ان سے باہر کام کرنے والے اداروں سے حاصل کیے گئے قرض پر ''ربا'' کی ادائیگی، ممانعتِ ''ربا'' کے قوانین کے دائرے میں نہیں آئے گی۔ حکومتِ پاکستان کو البتہ واضح طور پر ہدایت کی جانی چاہیے کہ وہ اس بات کی حتی الوسع کوشش کرے کہ جب قرض لے تو وہ ''ربا'' کی شرط کے ساتھ نہ ہو۔ لیکن مشہور ہے کہ ''بھکاری انتخاب کا حق نہیں رکھتے''، اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ''ربا'' کی ادائیگی کے بغیر معاملہ نہ ہو پا رہا ہو تو ظاہر ہے کہ پھر معاہدوں کی پابندی کرتے ہوئے ''ربا'' کی ادائیگی کی جائے گی۔ مگر اس سے ممانعتِ ''ربا'' کے قانون کی ان شقوں پر کوئی فرق نہیں پڑے گا جن کا اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں۔

پانچواں سوال

حکومت پاکستان اور حکومت کے تحت کچھ دوسرے ادارے بانڈز اور سرٹیفکیٹ وغیرہ جاری کر کے قرض حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ سرٹیفکیٹس اور بانڈز رکھنے والوں کو مقررہ منافع دیتے ہیں۔ کیا یہ منافع بھی ''ربا'' کے زمرے میں آتا ہے؟

جواب

حکومتِ پاکستان اور حکومت کے تحت دوسرے ادارے سرٹیفیکٹس اور بانڈز کے اجرا سے جو رقم بطور

قرض حاصل کرتے ہیں، اس پر دیا جانے والا ''منافع'' چونکہ پیشگی طور پر متعین شدہ شرح پر دیا جاتا ہے، اس وجہ سے یہ ''منافع'' دراصل ''ربا'' ہی کے زمرے میں آتا ہے۔

چھٹا سوال

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کاغذی کرنسی کی قدر (Value) افراطِ زر کے باعث کم ہو جاتی ہے۔ جب قرض دینے والے کو ایک خاص مدت کے بعد اس کی رقم لوٹائی جاتی ہے تو اس وقت اس افراطِ زر کے باعث اسے نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس صورت میں قرض دینے والا اس نقصان کی تلافی کے لیے قرض لینے والے سے کچھ زائد رقم کا تقاضا کرے تو کیا یہ تقاضا بھی ''ربا'' ہی شمار ہو گا؟

جواب

اگر افراطِ زر کی صحیح شرح کے مطابق قرض کی اصل رقم سے کچھ زائد رقم کا تقاضا کیا جائے تو وہ ''ربا'' شمار نہیں ہو گا۔ اس صورت میں نہ قرض دینے والا قرض کے استعمال پر پہلے سے متعین شدہ زائد رقم کا تقاضا کرتا ہے اور نہ اس زائد رقم کو حقیقی طور پر نفع کہا جا سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

افراطِ زر یا روپے کی حقیقی قدر میں کمی بیشی کے لحاظ سے قرضوں کی ایڈجسٹمنٹ کے لیے عدل و قسط پر مبنی کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ یہ معاملہ حکومتِ پاکستان کی طرف سے اعلان کی گئی افراطِ زر کی شرح کے مطابق کیا جائے۔

۲۔ یہ معاملہ ملک میں سب سے زیادہ صرف ہونے والی چند چیزوں کی اوسط قیمت کے مطابق کیا جائے۔

۳۔ یہ معاملہ ملک میں سونے کی قیمت میں جو اتار چڑھاؤ آتا ہے اس کے مطابق کیا جائے۔ مثال کے طور پر قرض کے لین دین کے موقع پر دونوں فریقین اس وقت مارکیٹ میں سونے کی قیمت کے لحاظ سے معاہدے میں یہ شرط رکھ لیتے ہیں کہ قرض کی واپسی کے وقت مارکیٹ میں سونے کی جو قیمت ہو گی اس کے مطابق ادائیگی کی جائے گی۔ فرض کریں، اسلم خاور کو ۱۰۰ روپے قرض دیتا ہے اور اس وقت مارکیٹ میں سونے کی قیمت ۱۰۰ روپے فی گرام ہے، تو اس وقت یہ طے پائے گا کہ خاور نے اسلم سے ۱۰۰ گرام سونا قرض لیا ہے۔ پھر جب خاور قرض اتارتا ہے اور اس وقت سونے کی قیمت ۱۵۰ روپے فی گرام ہے تو اسے ۱۵۰ روپے واپس کرنا ہوں گے۔ اسی طرح اگر قرض لوٹاتے وقت سونے کی قیمت ۹۰ روپے فی گرام ہو تو خاور اسلم کو ۹۰ روپے واپس کرے گا۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ہمارے نزدیک قرض کے لین دین میں افراطِ زر کے مطابق ایڈ جسٹمنٹ نہ صرف جائز بلکہ مطلوب ہے۔ جس طرح ایک قرض دینے والا ''ربا'' وصول کر کے قرض لینے والے پر ظلم کرتا ہے اسی طرح قرض لینے والا قرض اتارتے وقت افراطِ زر کی حقیقت نظر انداز کر کے قرض دینے والے پر ظلم کرتا ہے۔

ساتواں سوال

اگر انٹرسٹ اور مارک اپ کی تمام صورتیں اسلامی احکام سے متصادم ہیں تو سرمایہ کاری کے حسبِ ذیل معاملات کے لیے آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟

۱۔ تجارتی سرمایہ کاری۔ ۲۔ صنعت کاری۔ ۳۔ بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لیے سرمایہ کاری۔ ۴۔ غیر ملکی قرض کا حصول۔ ۵۔ اور اسی طرح کی دوسری ضرورتیں اور مقاصد۔

جواب

اس نوعیت کے مسائل حل کرنا علماے دین کا کام نہیں ہے۔ اس کے لیے مسلمان ماہرینِ معیشت کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ علماے دین سے دین و شریعت کے احکام ہی سے متعلق رہنمائی لینی چاہیے۔ علماے دین چونکہ معیشت کے ایسے علم سے صحیح طور پر واقف نہیں ہوتے اس لیے وہ اس معاملے میں صحیح جواب نہیں دے پاتے۔ ایسے سوال تاحال جواب سے اس لیے محروم ہیں کہ علماے دین اس سطح کی معاشی پیچیدگیوں کا ادراک نہیں کر پاتے لیکن وہ پھر بھی جواب دے دیتے ہیں جس سے مسئلہ جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں ملک اور امتِ مسلمہ کے ماہرینِ معیشت سے تجاویز لی جائیں۔ اس کے بعد علماے دین سے یہ رہنمائی لی جائے کہ ان تجاویز میں قرآن و سنت کی رو سے کوئی قباحت تو نہیں پائی جاتی۔

اس ضمن میں یہ رہنما اصول ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سرمایہ کاری کا ہر وہ نظام جس میں قرض پر پہلے سے طے شدہ زائد رقم کی شرح (مثلاً سالانہ شرح) مقرر کر لی جائے تو وہ ''ربا'' ہے جو اسلامی شریعت میں ممنوع ہے۔ سرمایہ کاری کا جو نظام اس چیز سے پاک ہے اسے ''ربا'' سے پاک قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں مجوزہ یا متبادل ہر نظام کے شرعاً جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔

آٹھواں سوال

اگر آپ اس نقطۂ نظر کے حامل ہیں کہ انٹرسٹ کی تمام صورتیں شرعاً ممنوع ہیں تو آپ اس کو ملکی معیشت

سے ختم کرنے کے لیے کیا طریق کار تجویز کرتے ہیں؟ اگر اس معاملے میں کوئی تدریجی طریقہ اپنایا جائے تو اس کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے جو قرآن وسنت کے تقاضوں کو بھی مجروح نہ کرے؟

جواب

ساتویں سوال کی طرح یہ سوال بھی مسلمان ماہرینِ معیشت سے کرنا چاہیے۔ البتہ، مسلمان ماہرینِ معیشت اگر اس مسئلے کا کوئی تدریجی حل پیش کرتے ہیں تو پھر علماے دین سے یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اسلام اس طریقے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟

اس ضمن میں عرض ہے کہ معاشرتی برائیوں کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ تدریجی طریقہ ہی اختیار کیا جائے۔ کسی نظام یا برائی کی اصلاح میں تدریجی طریقے کو اختیار کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس ضمن میں غلامی جیسی برائی کے خاتمے کی کوشش کو پیشِ نظر رکھیں۔ نزولِ قرآن کے وقت یہ برائی معاشرے میں موجود تھی۔ قرآن ہمیشہ اس برائی کا مخالف رہا لیکن چونکہ یہ برائی بہت سنگین شکل اختیار کیے ہوئے تھی اور معاشرے میں اپنی جڑیں گہرائی میں پھیلا چکی تھی اس لیے قرآن نے اس کی اصلاح کے لیے ۲۳ سال کے عرصے میں پھیلے ہوئے ایسے اقدام کیے جن سے اس برائی کے خاتمے کی راہ ہموار ہوئی۔

اسی طرح، ماہرین کے نزدیک معیشت کو ''ربا'' سے پاک کرنے کے لیے اگر تدریجی طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے، تو پھر اسی طریقے کو اختیار کرنا ہوگا۔ معیشت کو ''ربا'' سے پاک کرنے کے لیے اٹھنے والا پہلا قدم، خواہ اس کے لیے جو طریقہ بھی اختیار کیا جائے، صحیح سمت میں اٹھنے والا ہوگا۔

نواں سوال

اگر تمام مالی معاملات خلافِ شرع ہیں تو اس ضمن میں ماضی میں کیے گئے معاملات اور معاہدات کا کیا کیا جائے گا؟ خاص طور پر حکومت پچھلے غیر ملکی قرضوں کے معاملے میں کیا طریق کار اختیار کرے؟

جواب

اس معاملے میں بغیر کسی استثنا کے تمام غیر ملکی قرض دینے والوں کے ساتھ کیے گئے معاہدات کی پاس داری کی جائے اور معاہدات میں ''ربا'' دینے سے متعلق فریقین کے مابین جو شرائط طے ہوئی تھیں انھیں پورا کیا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جائے گا، الّا یہ کہ باہمی رضامندی سے معاہدے میں کوئی ترمیم کرلی جائے۔

''ربا'' کے خاتمے پر مبنی قانون سازی کرنے کے بعد حکومتِ پاکستان ''ربا'' لینے سے ہر حال میں گریز کرے گی۔ البتہ اسے غیر ملکی قرض خواہوں کو معاہدات کے مطابق ''ربا'' ادا کرنا ہو گا۔ مستقبل کے حوالے سے عدالتِ عظمیٰ کو حکومتِ پاکستان کو یہ ہدایت کرنی چاہیے کہ وہ ان امور سے متعلق اپنی اخلاقی ذمہ داری محسوس کرے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور جس حد تک ممکن ہو آیندہ طے پانے والے معاہدات کو ''ربا'' سے پاک رکھے۔

جہاں تک اندرونِ ملک قرضوں کا معاملہ ہے تو ''ربا'' کی ممانعت پر مبنی قانون سازی کے بعد ایک ریاست ''ربا'' کی ادائیگی فوری طور پر روک سکتی ہے۔ مگر ایسا کرنے کے لیے ضروری ہو گا کہ حکومت عوام سے لیے گئے قرضے بھی فوری طور پر واپس کرنے کی پوزیشن میں ہو۔ لیکن یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حکومت کی موجودہ مالی پوزیشن میں یہ ممکن نہیں ہے۔ اس صورتِ حال میں خاص طور پر جبکہ لوگوں کی ایک ناقابل تعین تعداد کی معیشت کا انحصار حکومت کی طرف سے جاری کردہ سرٹیفیکٹس اور بانڈز ہی کی آمدنی پر ہے، حکومت پر یہ لازم ہے کہ وہ ان لوگوں کے لیے جو ''ربا'' سے بچنا چاہتے ہیں، ''ربا'' سے پاک متبادل مہیا کرے۔ جب تک حکومت ان تقاضوں کو پورا کرنے کی پوزیشن حاصل نہیں کر پاتی اس وقت تک اسے چاہیے کہ وہ شہریوں کو ''ربا'' لینے کے جرم کی کراہیت سے قرآن وسنت کی روشنی میں متنبہ کرے اور ''ربا'' لینے کے معاملے میں ان کی اخلاقی لحاظ سے حوصلہ شکنی کرے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

دسواں سوال

کیا قرض دینے والا قرض سے متعلق منافع حاصل کرنے کا وقت اور اس کی شرح مقرر کر سکتا ہے جبکہ مقروض یہ کہہ رہا ہو کہ وہ مطلوبہ روپیہ کمانے اور بروقت رقم لوٹانے کے قابل ان شاء اللہ ہو جائے گا۔ اور اگر اس کے بعد مقروض رقم کی ادائیگی میں تاخیر کرے تو گارنٹی دینے والا منافع، بونس یا تلافی کے لیے زائد رقم دے سکتا ہے۔ اگر اس صورتِ حال میں انشورنس کا نظام متعارف کرایا جائے تو دین اس پر کوئی اعتراض کرتا ہے؟

جواب

قرض پر پیشگی ''منافع کی شرح'' مقرر کرنا واضح طور پر ''ربا'' ہے۔ جو شخص ایسے ''منافع'' کے لیے ضامن

بنتا ہے وہ دراصل ''ربا'' کی ادائیگی کا ضامن بنتا ہے۔ اس صورت میں منافع کی انشورنس کرنے والے کی بھی وہی پوزیشن ہو گی جو ''ربا'' کی ادائیگی کے ضامن کی ہو گی۔

''ربا'' کا ضامن بننا دراصل شریعت کے ٹھیرائے ہوئے ایک منکر کا ضامن بننا ہے۔ ان معاملات میں جو شخص یا ادارہ ''ربا'' حاصل کر رہا ہے وہ شریعت کی نظر میں ایک بڑے جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔[1]

—— معز امجد / محمد بلال

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۔ جو لوگ اس تحریر کے اصل مسودے کا مطالعہ کرنا چاہیں وہ ہمارے ساتھ رابطہ کر سکتے ہیں۔ (ادارہ)

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(۷)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَاِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنِّىۡ جَاعِلٌ فِى الۡاَرۡضِ خَلِيۡفَةً ؕ قَالُوۡٓا اَتَجۡعَلُ

اور[۶۷] (یہود کے اِس رویے کو سمجھنے کے لیے، اے پیغمبر) یاد کرو[۶۸] وہ واقعہ جب تمھارے

۶۷۔ ابلیس و آدم کی یہ سرگذشت ایک آئینہ ہے جس میں اُس ردِ عمل کی پوری تصویر دکھا دی گئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے آپ کے مخاطبین، بالخصوص یہود پر ہوا۔ زمین میں ایک صاحبِ اقتدار مخلوق کی پیدایش کے بارے میں جو شبہات فرشتوں نے پیش کیے، وہ چونکہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی اسکیم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے پوری اسکیم سامنے آجانے کے بعد دور بھی ہو گئے، لیکن ابلیس کا اعتراض حسد اور تکبر کی بنا پر تھا وہ نہ دور ہوا، نہ ہو سکتا تھا۔ بعینہٖ یہی معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے موقع پر پیش آیا۔ حق کے سچے طالب اپنے شبہات لے کر آئے اور ان کے دور ہو جانے کے بعد ایمان لے آئے۔ یہود کا حسد و تکبر، اس کے برعکس اُن کے لیے ابدی محرومی کا باعث بن گیا، لیکن جس طرح ابلیس کی مخالفت کے علی الرغم آدم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نافذ ہو کے رہا، اسی طرح یہود کے مخالفت کے علی الرغم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت بھی اس زمین پر ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئی۔

یہ سرگذشت جس سیاق میں یہاں بیان ہوئی ہے، اس کی رو سے اس کا مدعا یہی ہے، لیکن اس کے ساتھ،

اگر غور کیجیے تو قرآن کا علم الانسان بھی پوری وضاحت کے ساتھ اس میں بیان ہو گیا ہے۔ اس کے جو نکات اس سرگذشت سے سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ انسان کو صرف ارادہ و اختیار ہی نہیں ملا، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے زمین کا اقتدار بھی اسے بخشا ہے۔ یہ چیز ظاہر ہے کہ نشۂ قوت پیدا کر دینے کا باعث بن سکتی ہے، لہٰذا اس پر واضح رہنا چاہیے کہ: صاحب نظران نشۂ قوت ہے خطرناک۔ وہ اگر اس معاملے میں متنبہ نہ رہا تو اس کا نتیجہ وہی نکلے گا جو فرشتوں نے بیان کیا ہے کہ وہ زمین میں فساد پیدا کرے گا اور خون بہائے گا۔

۲۔ اسے جس آزمایش میں ڈالا گیا ہے، وہ ہرگز اس کے تحمل سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں اور ہر شہر اور ہر بستی میں صالحین کا وجود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ حوصلہ کرے تو اپنے پروردگار کی مدد اور توفیق سے اس آزمایش میں پورا اتر سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں اپنی جنتِ گم گشتہ دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔

۳۔ دنیا کی زندگی میں جو سب سے بڑا امتحان اسے پیش آئے گا، وہ انانیت اور جنسی جبلت کے راستے سے پیش آئے گا۔ پہلی صورت میں اسے فرشتوں کا نمونہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے جو ایک برتر مخلوق ہونے کے باوجود اللہ کے حکم پر اُس کے سامنے جھک گئے اور دوسری صورت میں اپنے باپ آدم کا نمونہ جو شیطان کے بہکانے پر جذبات میں بہ تو گئے، لیکن اس کیفیت سے نکلتے ہی فوراً اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آئے۔ چنانچہ اللہ نے اُن کی توبہ قبول کی، انھیں برگزیدہ کیا اور ان کی کمزوری کے پیشِ نظر اُن پر یہ عنایت فرمائی کہ اُن کی اولاد کے لیے اپنی ہدایت بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔

۴۔ غلطی کر لینے کے بعد، ابوالبشر آدم کی ندامت اور توبہ و انابت اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اپنے پروردگار کی ذات و صفات کا علم اور خیر و شر کا شعور لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ انبیا کی ہدایت اس کے بعد اور اس روشنی پر روشنی ہے اس لیے وہ قیامت کے دن یہ عذر پیش نہ کر سکے گا کہ ان بنیادی حقائق سے متعلق بھی اسے کسی پیغمبر کے انذار کی ضرورت تھی۔

۵۔ انسان کا نصب العین ازل ہی سے جنت الفردوس ہے۔ وہ اسی کو پانے کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے، لہٰذا اس کے تمام اعمال کا محرک یہی جنت ہے۔ وہ اگر اس کی اصلی جگہ پر اس کے حصول کی جدوجہد نہ بھی کر رہا ہو تو اس سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔ اپنے علم و عمل کی تمام صلاحیتیں وہ پھر اسی دنیا میں اسے پا لینے کی جدوجہد میں صرف کر دیتا ہے۔ یہ چیز اس کی فطرت میں ودیعت ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسی نصب العین کے لیے جیتا

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ
قَالَ اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى

پروردگار نے فرشتوں [۶۹] سے کہا: میں زمین میں ایک ایسی مخلوق بنانے والا ہوں جسے اقتدار دیا جائے گا۔ [۷۰] اُنھوں نے عرض کیا: کیا آپ اُس میں وہ مخلوق بنائیں گے جو وہاں فساد کرے گی اور خون بہائے گی [۷۱] دراں حالیکہ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ آپ کی تسبیح و تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں؟ [۷۲] فرمایا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے [۷۳] اور (اُنھیں سمجھانے کے لیے) آدم کو سب نام

اور اسی کے لیے مرتا ہے۔

۶۸۔ یہ سرگذشت چونکہ انسان کی اپنی ہی سرگذشت ہے جس کی روایت اس کے باپ آدم سے نسلاً بعد نسلٍ اسے منتقل ہوتی رہی ہے، اس لیے —— 'یاد کرو' —— کا یہ اسلوب اس کے لیے موزوں ہوا۔

۶۹۔ فرشتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو مکالمہ ان آیات میں نقل ہوا ہے، اس سے واضح ہے کہ وہ محض قوتیں نہیں ہیں جنھیں 'ملئکة' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، بلکہ نہایت پاکیزہ صفات کی حامل ایک مستقل مخلوق کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۷۰۔ اصل میں لفظ 'خلیفة' استعمال ہوا ہے۔ سورۂ ص (۳۸) کی آیت ۲۶ سے واضح ہے کہ یہ جس طرح نائب اور جانشین کے معنی میں آتا ہے، اسی طرح نیابت اور جانشینی کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض صاحبِ اقتدار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

۷۱۔ فرشتوں نے انسان کے بارے میں اس اندیشے کا اظہار لفظ 'خلیفة' کی بنا پر کیا ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ جب ایک صاحبِ اختیار مخلوق کو زمین کا اقتدار دیا جائے گا تو اقتدار پا کر وہ یقیناً بہکے گی اور اس بہکنے کا نتیجہ خوں ریزی اور فساد کی صورت ہی میں ظاہر ہو گا۔

۷۲۔ یہ بات انھوں نے تخلیقِ آدم کی حکمت معلوم کرنے کے لیے کہی ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ اس تخلیق کا مقصد محض تسبیح و تقدیس تو ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ چنانچہ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس فتنۂ عالم کی تخلیق سے آپ کے پیشِ نظر کیا ہے؟ تسبیح کے ساتھ حمد اور تقدیس کے جو الفاظ انھوں نے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ
لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ
بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ

سکھا دیے۔[۷۴] پھر (جن کے نام سکھائے)، اُن (ہستیوں) کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا۔ پھر فرمایا: مجھے اِن لوگوں کے نام بتاؤ،[۷۵] اگر تم (اپنے اِس خیال میں) سچے ہو۔[۷۶] اُنھوں نے عرض کیا: آپ کی ذات ہر عیب سے منزہ ہے، ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا آپ نے بتایا ہے، علیم و حکیم تو اصل میں آپ ہی ہیں۔[۷۷] فرمایا: آدم، تم اِن ہستیوں کے نام اِنھیں بتاؤ۔ پھر جب اُس نے اُن

---

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

استعمال کیے ہیں، ان سے تشبیہ میں پوشیدہ تنزیہہ کے ساتھ اثبات کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ یعنی ہم آپ کی شانِ الوہیت کے منافی صفات سے آپ کو پاک قرار دیتے اور اس کے ساتھ ان صفات سے متصف قرار دیتے ہیں جن کی بنا پر آپ سزاوارِ حمد و شکر ہیں۔

۷۳۔ مطلب یہ ہے کہ میری اسکیم کے سارے پہلوؤں پر تمھاری نظر نہیں ہے۔ یہ جب واضح ہو جائیں گے تو تمھارا اشکال بھی ختم ہو جائے گا۔

۷۴۔ اصل الفاظ ہیں: 'علم آدم الاسماء کلھا' ان میں 'اسماء' پر الف لام عہد کا ہے اور مراد اس سے آدم علیہ السلام کی ذریت میں سے بالخصوص ان لوگوں کے نام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیارات پا کر خود بھی ان کا حق ادا کریں گے اور دوسروں کو بھی ان کا حق ادا کرنے کی ترغیب دیں گے، یہاں تک کہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بارہا اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔ یعنی اولادِ آدم میں سے انبیا و رسل، مجددین، مصلحین اور شہدا و صدیقین۔

۷۵۔ 'نام بتاؤ' —— یعنی تعارف کراؤ۔ اس مفہوم کے لیے یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی معروف ہے۔

۷۶۔ یعنی اپنے اس خیال میں کہ اولادِ آدم کو زمین کا اقتدار دیا گیا تو وہ اس میں فساد برپا کر دے گی۔

۷۷۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی شان اس سے بلند ہے کہ آپ کا کوئی کام حکمت سے خالی ہو۔ ہم نے اپنا جو

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿٣٣﴾

کا تعارف اُنھیں کرا دیا تو فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید میں ہی جانتا ہوں،[۷۸] اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کر رہے ہو[۷۹] اور جو تم چھپا رہے تھے،[۸۰] ۳۰-۳۳

شبہ ظاہر کیا ہے، وہ محض ہمارے علم کی کمی کا نتیجہ ہے۔ ہمارا علم محدود ہے، علم و حکمت کا اصلی خزانہ تو آپ ہی کے پاس ہے۔

۷۸۔ یعنی اس کارخانۂ حکمت کی ساری حکمتیں اور مصلحتیں مجھے ہی معلوم ہیں۔ مجھ سے اس قدر قرب کے باوجود تم ان کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

۷۹۔ اس سے تخلیقِ آدم کی اسکیم کے وہ پہلو مراد ہیں جو فرشتوں نے سوال کی صورت میں سامنے رکھ دیے تھے۔

۸۰۔ یعنی ہماری اسکیم کی حکمت کو سمجھنے کی وہ خواہش جو تم نے الفاظ میں بیان نہیں کی، لیکن تمھارے سوال کے پیچھے در حقیقت وہی چھپی ہوئی تھی۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

زمانہ اور خدا

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۲۲)

عن ابی هریرہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: قال اللّٰہ تعالیٰ: یؤذینی ابن آدم یسب الدھر، بیدی الامر، اقلب اللیل والنہار.

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لغوی بحث

'یؤذینی': اس سے جسمانی تکلیف بھی مراد ہوتی ہے اور ذہنی بھی۔ گویا یہ ہاتھ سے تکلیف پہنچانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور ایسے قول وفعل کے لیے بھی جو دوسرے کو ناگوار گزرے۔ اس روایت میں یہ اسی دوسرے مفہوم میں آیا ہے۔

'یسب': گالی دینا۔ برا بھلا کہنا۔ یعنی کوئی ایسی بات کہنا جس سے دوسرے کی توہین ہوتی ہو یا اس کے کردار اور وقار پر حرف آتا ہو۔

'الدھر': یہ 'عصر' سرخ کا مترادف ہے۔ اس کا اطلاق لمبی مدت پر بھی ہوتا ہے اور ازل سے ابد تک کے عرصے پر بھی اسی طرح یہ محض گردشِ لیل ونہار کے لیے بھی آجاتا ہے۔ اس روایت میں یہ اسی معنی میں ہے۔

'بیدی الامر': 'الامر بید فلان' کا مطلب ہے کہ فلاں معاملے کا ذمہ دار ہے۔ اس روایت میں 'امر' کا لفظ امورِ کائنات کے لیے آیا ہے۔ لہٰذا اس کا ترجمہ 'نظامِ عالم' کرنا موزوں ہوگا۔

'اقلب': پھیر دینا۔ پلٹ دینا۔ یہاں رات کو دن میں اور دن کو رات میں بدل دینے کے لیے آیا ہے۔

ترجمہ

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ابنِ آدم زمانے کو گالی دے کر مجھے اذیت دیتا ہے، حالانکہ زمانہ میں ہی ہوں۔ تمام نظامِ عالم میرے ہاتھ میں ہے اور دن اور رات کو بھی میں گردش میں رکھتا ہوں۔''

متون

کتبِ حدیث میں اس روایت کے متعدد متون روایت ہوئے ہیں۔ بعض متون میں فرق بہت معمولی ہے۔ مثلاً بعض روایات میں 'بیدی الامر' بعض میں 'اقلب اللیل والنہار'، اور بعض میں یہ دونوں ہی جملے موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح بعض روایات میں یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے قول کی حیثیت میں روایت نہیں ہوئی بلکہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو زمانے کو گالی دینے سے منع فرمایا ہے اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو زمانے میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔

اس سے ملتے جلتے مضمون کی ایک اور روایت بھی ملتی ہے۔ بخاری میں ہے:

عن ابی هريره رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: لا تسموا العنب الكرم ولا تقولوا خيبة الدهر فان الله هو الدهر. (کتاب التوحید باب ۳۵)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انگور (کی بیل) کو کرم نہ کہو اور نہ (کسی کو) نامرادِ زمانہ کہو۔ اس لیے کہ اللہ ہی زمانہ ہے۔''

مسلم کی ایک روایت (کتاب الالفاظ من الادب وغیرها، باب ۲) میں تصریح ہے کہ انگور کو کرم (صاحبِ فیض) اس لیے نہ کہو کہ یہ حیثیت مسلمان کی ہے۔

ان روایات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ خیال آتا ہے کہ جیسے یہ دونوں روایات ایک ہی موقع کی گفتگو کے اجزا ہیں۔

معنی س

اس روایت میں اصلاً جو بات بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں روز و شب جو واقعات پیش آتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ لہٰذا وقت، زمانہ، چرخ اور آسمان کی طرف مصائب و آلام کی نسبت کر کے ہم انھیں برا بھلا کہتے ہیں۔ یہ در حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کے بارے میں ناروا گفتگو کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

اس طرح کی باتوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔

بعض لوگوں نے 'انا الدھر' کے الفاظ کو تصورِ زمان سے متعلق فلسفے کی بحث سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس جملے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ روز و شب کی گردش میں جو کچھ وجود میں آتا ہے، اس کو وجود میں لانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ان الفاظ کی یہی حقیقت روایت کے آخری جملے 'اقلب اللیل والنہار' سے بھی واضح ہوتی ہے۔

قرآن سے تعلق

جس طرح ہمارے ہاں برے حالات کی نسبت زمانہ، گردشِ دوراں یا فلکِ پیر کی طرف کی جاتی ہے اور پھر انھیں برا بھلا کہا جاتا ہے، اسی طرح یہ طریقہ اہلِ عرب کے ہاں بھی رائج تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس طریقے سے روک دیا۔ عربوں کے اس طریقے کے بارے میں قرآنِ مجید میں کوئی بات نہیں کہی گئی۔ البتہ قرآنِ مجید کی آخرت کی دعوت کا انکار کرتے ہوئے عربوں نے جو مختلف موقف اختیار کیے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ. (الجاثیہ ۴۵: ۲۴)	"اور وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ یہیں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو بس گردشِ روزگار ہلاک کرتی ہے۔ اور ان کو اس باب میں کوئی علم نہیں۔ محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں۔"

قرآن مجید نے یہاں یہ بات واضح کی ہے کہ تمھارا یہ خیال غلط ہے کہ تمھاری زندگی صرف اسی دنیا تک محدود ہے اور عروج و زوال اور نعمت و نقمت کے حالات محض مادی اسباب و علل کے مرہون ہیں۔ اس کائنات کا نظام خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ تمھارے اعمال کی پاداش میں تمھیں دنیا میں بھی تنبیہ کرتا ہے اور آخرت میں بھی تم اپنے کیے کو بھگتو گے۔

کتابیات

بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب ۲۸۳، کتاب الادب، باب ۱۰۱، کتاب التوحید، باب ۳۵، مسلم، کتاب الالفاظ من الادب وغیرھا، باب ۱، باب ۲، ابوداؤد، کتاب الادب، باب ۱۸۱، مسندِ احمد عن ابی ہریرہ۔

طالب محسن

صبرِ خداوندی

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۲۳)

وعن ابی موسی الاشعری، قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: قال اللّٰہ تعالیٰ: ما احد اصبر علی اذی یسمعہ من اللّٰہ، یدعون لہ الولد، ثم یعافیھم ویرزقھم.

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لغوی بحث

'اصبر': 'صبر' سے 'افعل'، کا صیغہ ہے۔ صبر بے کسی اور بے چارگی کی کیفیت کا نام نہیں بلکہ اس رویے کا نام ہے جسے ہم عزم، حوصلے اور استقلال کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا عملی اظہار جادۂ مستقیم پر استقامت اور ردِ عمل کے اظہار میں بردباری اور وقار کے تقاضے ملحوظ رکھنے سے ہوتا ہے۔ صبر کی ضرورت خارجی شدائد کے مقابلے کے لیے بھی ہوتی ہے اور داخلی کرب کی برداشت کے لیے بھی۔ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے فوراً گرفت نہ کرنے اور انسانوں کو اصلاح کا موقع دینے پر ہوا ہے۔

'اذی': یہ مصدر ہے اور تکلیف، تکلیف دہ اور انتہائی ناگوار کے معنی میں آتا ہے۔

'یدعون لہ': یہ لفظ 'د' کے سکون کے ساتھ 'یدْعون' بھی روایت ہوا ہے اور تشدید کے ساتھ 'یدَّعون' بھی۔ ہمارے نزدیک اصلاً 'یدْعون' ہے۔ اس ترجیح کی دلیل قرآنِ مجید میں اسی مضمون کو بیان کرنے کے لیے اسی فعل کا استعمال ہے:

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا. (مریم۱۹:۹۱) ''کہ انھوں نے خدا کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا''

'یعافیھم': عافیت میں رکھنا۔ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اس کے معنی مخلوق کو نقصانات اور مصائب سے بچانے کے ہوں گے۔

ترجمہ

''حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرمانِ خداوندی ہے: اللہ تعالیٰ سے زیادہ تکلیف دہ بات سن کر صبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ لوگ اس کی اولاد کے مدعی ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود وہ انھیں عافیت میں رکھتا اور انھیں رزق دیتا رہتا ہے۔''

متون

اس روایت کے متون بہت زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ ایک روایت میں 'یدعون له ..... الخ' کے بجائے 'یجعلون له ندا ویجعلون له ولدا و هوا مع ذلك یرزقهم و یعافیهم و یعطیهم' اور ایک دوسری روایت میں 'انه یشرك به و یجعل له ولد و هو یعافیهم و یدفع عنهم و یرزقهم' آیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی فرق ہیں۔ لیکن وہ بہت معمولی ہیں۔ انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معنی

اس روایت میں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے کے ایک پہلو کو واضح کیا گیا ہے۔ تمام انبیا انسانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے آئے تھے کہ یہ زندگی امتحان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہلتِ عمر میں حق و باطل کو اختیار کرنے کا کھ موقع دیا ہے۔ یہ موقع دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان سنگین ترین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ انھی جرائم میں سے ایک شرک کا جرم ہے۔ شرک جہاں ایک پہلو سے انسان کی بے بصیرتی کا مظہر ہے، ایک دوسرے پہلو سے اللہ تعالیٰ کی توہین بھی ہے۔ شرک کی کسی بھی صورت کا مطالعہ کریں وہ خدا کی صفات کے باب میں شرک کرنے والے کے تصور کی خامی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، وہ ہستی جو ہر طرح کے نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے، اس کے ساتھ شرک، اس کی صریح توہین ہی بنتا ہے۔ بطورِ خاص، خدا کے لیے اود کا تصور اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی توہین ہے۔ وہ ہستی جس نے ہر ہر شے کو عدم سے وجود بخشا ہے، وہ جو ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گی، اس کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ اس کی اولاد ہے، لاریب ایک بڑی

گستاخی ہے۔اس روایت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس طرح کے جرائم کے باوجود اللہ تعالیٰ آزمایش کی اس مہلت میں انسانوں کو نہ رزق سے محروم کرتا ہے اور نہ انھیں کسی عمل سے زبردستی روکتا ہے۔

قرآن سے تعلق

قرآنِ مجید میں بھی آزمایش کی اس مہلت کو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ انفال میں کفار پر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ تمھاری غلط روی اور سنگین جرائم کے باوجود تمھیں صفحۂ ہستی سے مٹایا نہیں گیا، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ نے جو مہلت دے رکھی ہے وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے:

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. (الانفال ۸:۶۸)

”اگر اللہ کا نوشتہ پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو روش تم نے اختیار کی اس کے باعث تم پر ایک عذابِ عظیم آدھمکتا۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کتابیات

بخاری، کتاب الادب، باب ۱، کتاب التوحید، باب ۳، مسلم، کتاب صفۃ القیامۃ، باب ۱۰۔ احمد عن ابی موسیٰ الاشعری۔

میزان

جاوید احمد غامدی

قانونِ دعوت

(نئی اشاعت کے لیے مصنف کی طرف
سے نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے بعد)

(۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (التوبہ ۹: ۱۲۲)

''اور سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس کام کے لیے نکل کھڑے ہوتے ولیکن ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو انذار کرتے، جب (علم حاصل کر لینے کے بعد) اُن کی طرف لوٹتے، اس لیے کہ وہ بچتے۔''

دعوت کا یہ حکم علما کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے، لیکن ان کی ہر جماعت میں سے کچھ لوگوں کو لازماً اس مقصد کے لیے نکلنا چاہیے کہ وہ دین کا علم حاصل کریں اور اپنی قوم کے لیے نذیر بن کر اسے آخرت کے عذاب سے بچانے کی کوشش کریں۔

سورۂ توبہ کی اس آیت پر غور کیجیے تو اس سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دعوت کا جو حکم اس میں بیان ہوا ہے، اس کا مکلف اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان کو قرار نہیں دیا۔ آیت کی ابتدا ہی اس جملے سے ہوئی ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس کام کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ ہر صاحبِ ایمان سے یہ توقع تو کی جا سکتی ہے کہ وہ قرآنِ مجید کے حکم: 'وتواصوا بالحق وتواصوا

بالصبر' کے تحت اپنے ماحول میں، اپنے اعزہ و اقارب اور اپنے احباب کو حق کی نصیحت کرتا رہے، لیکن اپنی قوم کی اصلاح اور اس کو انذار، یہ وہ چیز نہیں ہے جس کی توقع ہر مسلمان سے کی جائے۔اِس امت میں وہ لوگ بھی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور وہ لوگ بھی ہیں جن کے لیے اپنے روزانہ کے کاموں کو بھی عقل و بصیرت کے ساتھ انجام دینا بارہا مشکل ہو جاتا ہے۔ صنعت و حرفت، زراعت و تجارت اور دنیا کے دوسرے علوم و فنون کی خدمت ہی کو اپنا اصل کام بنانے والے بھی اس میں شامل ہیں اور وہ بھی جن کی ساری دل چسپی علومِ عربیت اور قرآن و سنت میں تدبر ہی سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات صاف واضح کر دی ہے کہ تمام مسلمانوں کو نہیں، بلکہ ان کے ہر گروہ میں سے چند لوگوں ہی کو اس کام کے لیے نکلنا چاہیے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ اس کام کے لیے نکلنے کا حوصلہ کریں، اُن کے لیے ضروری ہے کہ پہلے دین کا علم حاصل کریں۔ اس کے لیے آیت میں 'لیتفقھوا فی الدین' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین میں بصیرت پیدا کریں، اِس کے فہم سے بہرہ مند ہوں اور اِس کی حقیقتوں کو سمجھیں۔ لوگوں کے لیے اندھے راہ بتانے والے بن کر نہ اٹھیں، بلکہ اٹھنے سے پہلے دین کو اس طرح جان لیں جس طرح اسے جاننے کا حق ہے۔ یہ چیز دین کے منابع، یعنی قرآن و سنت سے براہِ راست تعلق پیدا کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ اس کام کے لیے اٹھنے والے قرآن و سنت کے علوم میں گہری بصیرت پیدا کریں تاکہ پورے اعتماد کے ساتھ وہ لوگوں کے سامنے دین کی شرح و وضاحت کر سکیں۔

تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دین کا علم حاصل کر لینے کے بعد دعوت کی جو ذمہ داری اُنھیں ادا کرنی ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ''انذار'' اور صرف ''انذار'' ہے، یعنی یہ کہ حیاتِ اخروی کی تیاریوں کے لیے لوگوں کو بیدار کیا جائے۔ یہ اگر غور کیجیے تو بعینہٖ وہی کام ہے جو اللہ کے نبی اور رسول اپنی قوم میں کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے بعد ''انذار'' کا کام اس امت کے علما کو منتقل ہوا ہے اور ختمِ نبوت کے بعد یہ ذمہ داری اب قیامت تک انھیں ہی ادا کرنی ہے۔

چوتھی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دعوت کے ہر داعی کے لیے اصل مخاطب کی حیثیت اُس کی اپنی قوم ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'ولینذروا قومھم اذا راجعوا الیھم' (اور اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتے، جب ان کی طرف لوٹتے)۔ آیت کا یہی حصہ ہے جس سے اس دعوت کا دائرہ بالکل متعین ہو جاتا اور

اس چیز کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ اس کے داعی اصل حق داروں کو چھوڑ کر یہ دولت جہاں تہاں دوسروں میں بانٹتے پھریں۔

پانچویں بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس دعوت کا مقصد ہر حال میں یہی ہونا چاہیے کہ لوگ اللہ پروردگارِ عالم کے معاملے میں متنبہ رہیں۔ آیت میں یہ مقصد 'لعلھم یحذرون' (تاکہ وہ بچیں) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ یعنی لوگ محتاط رہیں کہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دین کے جو مطالبات بھی اُن سے متعلق ہوتے ہیں، اُن کے بارے میں غفلت، تساہل یا تمرد اور سرکشی کا رویہ دنیا اور آخرت میں اُن کے لیے ہلاکت کا باعث نہ بن جائے۔ دنیا کی قیادت صالحین کو منتقل ہو جائے، دین کا غلبہ قائم ہو جائے اور اللہ کی بات ہر بات سے اونچی قرار پائے، یہ بے شک، ہر داعی کی تمنا ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے، لیکن دعوت کا اصلی مقصد اس آیت کی رو سے یہی ہے کہ لوگ آخرت کے عذاب سے بچیں اور قیامت میں انھیں کسی رسوائی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

اس سے واضح ہے کہ سورۂ توبہ کی یہ آیت علما کو اس بات کا مکلف ٹھیراتی ہے کہ 'جاھدوا فی اللّٰہ حق جہادہ'[1] کے جذبے سے وہ اپنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق امت کی ہر بستی اور ہر قوم میں اس دعوت کو ہمیشہ زندہ رکھیں۔ وہ اپنی قوم اور اس کے اربابِ حل و عقد کو اُن کے فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے میں پوری دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ خبردار کرتے رہیں۔ اُن کے لیے ہر سطح پر دین کی شرح و وضاحت کریں۔ اُنھیں ہر پہلو اور ہر سمت سے حق کی طرف بلائیں۔ اُس سے اعراض کے نتائج سے خبردار کریں اور جب تک زندہ رہیں، ان نتائج سے انھیں خبردار کرتے رہیں، یہاں تک کہ ظالم حکمرانوں کا ظلم بھی اُنھیں اِس کام سے باز نہ رکھ سکے۔ علما کے لیے یہی سب سے بڑا اجہاد ہے جو اس دنیا میں وہ ہمیشہ کر سکتے ہیں۔

امت کی تاریخ میں دعوت و عزیمت کے عنوان سے جو کام ہمیشہ ہوتے رہے ہیں، اُن کا ماخذ درحقیقت یہی آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ہماری تاریخ کا کوئی دور اُن لوگوں سے خالی نہیں رہا۔ جو بدعت و ضلالت کے تہ بہ تہ اندھیروں میں اپنے چراغ کی لو تیز کر کے سرِ راہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہو کر لوگوں کو حق کی راہ دکھاتے ہیں۔ وہ اس بات کی کوئی پروا نہیں کرتے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں اور کن چیزوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ اُن کی ساری دل چسپی بس حق ہی سے ہوتی ہے اور وہ اسی کے تقاضے دنیا کو بتانے کے لیے اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں صرف کر دیتے ہیں۔ وہ لوگوں سے کچھ نہیں مانگتے، بلکہ اپنے پروردگار سے جو کچھ

۱۔ الحج ۲۲: ۷۸، ''اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو، جیسا کہ اس جدوجہد کا حق ہے۔''

پاتے ہیں، بڑی فیاضی کے ساتھ ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ ہر دور میں وہ ہستی کا ضمیر، وجود کا خلاصہ اور زمین کا نمک قرار پاتے اور اس طرح غربت کے اُس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں جس کے بارے میں پیغمبر کا ارشاد ہے کہ: 'بدأ الاسلام غريباً ثم يعود غريباً كما بدأفطوبی للغرباء الذين يصلحون اذا فسد الناس'۔[2]

اس دعوت کی یہی نوعیت ہے جس کے پیشِ نظر یہ چند باتیں اس میں لازماً ملحوظ رہنی چاہییں:

اوّل یہ کہ اس کے لیے اٹھنے والے جس حق کو لے کر اٹھیں، اُس پر اُن کا اپنا ایمان بالکل راسخ ہونا چاہیے۔ وہ جو بات بھی لوگوں کے سامنے پیش کریں، اس پر ان کے دل و دماغ کو اس طرح مطمئن ہونا چاہیے کہ وہ خود بھی یہ محسوس کریں کہ یہ ان کے دل کی آواز اور روح کی صدا ہے جو ان کی زبان پر آئی ہے۔ وہ اپنی ساری شخصیت کو اپنے رب کے حوالے کر کے اس میدان میں اتریں اور جس چیز کی طرف لوگوں کو بلائیں، اس کے بارے میں سب سے پہلے خود یہ اعلان کریں کہ وہ پورے دل اور پوری جان سے اس پر ایمان لائے ہیں:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ.	''کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ پروردگارِ عالم کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو یہی حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔''
(الانعام ۶: ۱۶۳-۱۶۴)	

دوم یہ کہ ان کے قول و عمل میں کسی پہلو سے کوئی تضاد نہ ہو۔ وہ جس چیز کے علمبردار بن کر اٹھیں، سب سے پہلے خود اسے اپنائیں اور جس حق کی لوگوں کو دعوت دیں، اُن کا عمل بھی اسی کی شہادت دے۔ قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ یہ بے عمل واعظوں کا نہیں، بلکہ اُن اربابِ عزیمت کا کام ہے جو اپنی نصیحت کا مخاطب سب سے پہلے اپنے نفس کو بناتے اور پھر اُسے مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ بالکل آخری درجے میں اس حق کو اختیار کرے جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر واضح ہوا ہے۔ چنانچہ اُس نے علمائے یہود کو ملامت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم دین و شریعت کے عالم ہو اور خوب جانتے ہو کہ عقل و نقل کی رو سے تم پر عمل کی ذمہ داری

۲۔ احمد بن حنبل، ج ۴، ص ۷۳، ''اسلام کی ابتدا ہوئی تو وہ اجنبی تھا۔ وہ پھر اسی طرح اجنبی ہو جائے گا۔ پس مبارک ہیں وہ اجنبی جو لوگوں کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوں جب وہ فساد میں مبتلا ہو جائیں۔''

یہ روایت الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ امام مسلم کی ''الجامع الصحیح'' میں بھی بیان ہوئی ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ ہے، لیکن تم پر افسوس ہے کہ عوام کو بڑے زوروں سے حقوق و فرائض ادا کرنے کی تلقین کرتے ہو، مگر یہ تلقین کرتے وقت اپنے آپ کو بالکل بھول جاتے ہو:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (البقرہ ۲: ۴۴)

''کیا تم لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو؟ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟''

سوم یہ کہ حق کے معاملے میں وہ کبھی کسی مداہنت سے کام نہ لیں۔ دین کی چھوٹی سے چھوٹی حقیقت بھی جو ان پر واضح ہو جائے، اسے دل سے قبول کریں۔ اس کی زبان سے گواہی دیں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا کیے بغیر اسے بے کم و کاست دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔ وہ کسی حال میں بھی اس میں کوئی ترمیم و اضافہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ پورا حق جس طرح کہ قرآن و سنت سے ثابت ہے، اس کی ساری ہدایت اور سارے احکام سمیت لوگوں کو بتائیں اور ہر وہ چیز جو کسی پہلو سے اس کے خلاف ہو، اس کو بغیر کسی تردد کے رد کر دیں۔ دین کے بارے میں جو بات بھی ان سے پوچھی جائے، وہ اگر دین میں ہے تو اسے ہرگز نہ چھپائیں اور اُس کو اُسی طرح پیش کریں جس طرح کہ وہ فی الواقع ہے اور جس طرح کہ وہ اُسے مانتے ہیں۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ موقع بے موقع ہر بات کہتے رہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ حق کو ہمیشہ صحیح طریقے سے، صحیح موقع پر اور صحیح مخاطب کے سامنے ظاہر ہونا چاہیے، لیکن کسی ذاتی مفاد، کسی خطرے، کسی عصبیت یا کسی مصلحت کی خاطر اسے چھپانا اور اس کی گواہی سے احتراز کرنا، یہ وہ چیز نہیں ہے کہ جس کی کوئی گنجایش کم سے کم ان اہلِ دعوت کے لیے دین میں مانی جائے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

چنانچہ اللہ کے جو نبی اس کام کے لیے مبعوث ہوئے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات ایک قانون کی حیثیت سے بیان کی ہے کہ اللہ نے جو حالات و مراحل بھی ان کے لیے مقسوم کیے ہیں وہ کسی زحمت کے لیے نہیں کیے، اس وجہ سے ان کے لیے یہی زیبا ہے کہ اپنی ذمہ داری بے خوفِ لومۃ لائم ادا کریں اور اس معاملے میں اللہ کے سوا کسی سے کوئی اندیشہ نہ رکھیں:

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا.

''اور نبی کے لیے اللہ نے جو کچھ فرض کیا، اس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہی اللہ کی سنت ان سب نبیوں کے بارے میں رہی ہے جو پہلے گزرے ہیں

اِلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا. (الاحزاب ۳۳: ۳۸-۳۹)

— اور اللہ کے فیصلے کے لیے ایک وقت مقرر تھا — وہ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور حساب کے لیے بس اللہ ہی کافی ہے۔"

سورۂ مائدہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اس طرح واضح فرمائی ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ. وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ.

(المائدہ ۵: ۴۸-۴۹)

"اور اے پیغمبر، ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری، اُس کتاب کو سچا کرتی جو اس سے پہلے موجود ہے اور اس کے لیے کسوٹی بنا کر، اس لیے تم اُن کے درمیان فیصلہ کرو اُس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے نازل کی اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمھارے پاس آ چکا ہے، ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا، لیکن اُس نے چاہا کہ جو کچھ اُس نے تمھیں دیا ہے، اُس میں تمھیں آزمائے۔ چنانچہ بھلائیوں کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا وہ سب چیزیں جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ اور (تم پر یہ کتاب اتاری، اس لیے) کہ تم اُن کے درمیان فیصلہ کرو اُس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے نازل کی اور اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور اُن سے ہوشیار رہو

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کہ مبادا وہ تمھیں کسی حکم سے بہکا دیں جو اللہ نے تمھاری طرف اتارا ہے۔ پھر اگر وہ اعراض کریں تو جان لو کہ اللہ یہی چاہتا ہے کہ اُن کو اُن کے بعض گناہوں کی سزا دے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں میں سے زیادہ نافرمان ہی ہیں۔“

اسی طرح فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ. (المائدہ ۵: ۶۷)

”اے پیغمبر، تم پر جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو۔ اور (جان لو کہ) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اور (اطمینان رکھو کہ) اللہ لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا۔ بے شک، اللہ ان کافروں کو کبھی راہ یاب نہ کرے گا۔“

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا. (الاحزاب ۳۳: ۴۸)

”اور تم ان کافروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو اور اِن کی اذیتوں کو نظر انداز کرو اور اللہ پر بھروسا کرو اور اللہ اِس کے لیے بالکل کافی ہے کہ معاملہ اُس کے سپرد رہے۔“

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ۚ وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ. (الشوریٰ ۴۲: ۱۵)

”پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو، جیسا کہ تم کو حکم دیا گیا اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو اور اعلان کر دو کہ میں اس کتاب پر ایمان لایا جو اللہ نے اتاری ہے اور مجھے یہ حکم ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دوں۔ اللہ ہی ہمارا پروردگار ہے اور تمھارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تمھارے لیے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان
(اب) کسی بحث کا موقع نہیں رہا۔ اللہ ہم سب کو
(قیامت میں) جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب
کو جانا ہے۔“

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معز امجد

التزامِ جماعت ــــ اعتراضات کا جائزہ

(۵)

۵۔ ''الجماعۃ'' سے مراد ''سوادِ اعظم'' اور ''اہلِ سنت'' بھی ہیں؟

مولانا گوہر رحمٰن صاحب نے اپنے مضمون میں ''الجماعۃ'' کے کم از کم تین یا چار مختلف معنی بیان فرمائے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ایسی حکومت ہے جو ''اقامتِ دین'' کا ''فرض'' انجام دیتی ہو۔ (ماہنامہ ''فاران'' جون ۱۹۹۵ء، ص ۲۷)۔ دوسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ ''جماعۃ المسلمین'' اور امتِ مسلمہ ہم معنی الفاظ ہیں، گویا ''الجماعۃ'' سے مراد ''امتِ مسلمہ'' ہے (ص ۳۳) اور ایک تیسرے مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ ''الجماعۃ'' سے مراد امت کا ''سوادِ اعظم'' اور ''اہلِ سنت'' ہیں (ص ۳۱)۔ پہلی تینوں باتوں (یعنی یہ کہ ''الجماعۃ'' سے مراد ''اقامتِ دین'' کا فرض انجام دینے والی حکومت یا امتِ مسلمہ یا سوادِ اعظم ہے) کا جواب ہمارے مضمون کے پہلے حصے میں گزر چکا ہے۔ ہم یہاں مولانا کی چوتھی رائے، یعنی یہ کہ ''الجماعۃ'' سے مراد ''اہلِ سنت'' ہیں، کی تنقیح کریں گے۔

مولانا محترم اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''جماعتِ ناجیہ کو بعض احادیث میں الجماعۃ کہا گیا ہے، بعض میں السواد الاعظم کہا گیا ہے اور بعض میں 'ما انا علیہ واصحابی' کہا گیا ہے۔ ان تینوں کا مفہوم ایک ہے اس لیے کہ الجماعۃ میں الف لام عہد کے لیے ہے اور مراد ہے وہ جماعت جو سنتِ رسول اور سنتِ اصحابِ رسول پر قائم ہو، یہ جماعت بدعتی فرقوں کے مقابلے میں ہر ہر دور میں اکثریت ہی میں نہیں بلکہ غالب ترین اکثریت میں رہی ہے۔ اس لیے اس کو

السواد الاعظم کا نام بھی دیا گیا ہے۔ لیکن 'الاعظم' کے معنی 'اعظم شأنا و رفعة' بھی آتے ہیں، یعنی بڑی شان اور رفعت و درجے والی جماعت، اگرچہ اس کی تعداد سب سے کم ہو۔ احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے قریب ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ حق پر قائم رہنے والے مسلمان بہت کم ہوں گے اور معاشرے میں وہ غریب اور اجنبی ہوں گے۔'' (ماہنامہ ''فاران'' جون ۱۹۹۵ء، ص ۳۱)

مولانا محترم کی اس بات کے حوالے سے ہم سب سے پہلے تو ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ عربی زبان میں 'اعظم' کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس معنی میں ہم اردو زبان میں لفظِ ''بڑا'' استعمال کرتے ہیں۔ لفظ ''بڑا'' ہی کی طرح، عربی زبان میں 'اعظم' کے معنی وہ اسم موصوف طے کرتا ہے، جس کی صفت کے طور پر یہ لفظ جملے میں استعمال ہوا ہو۔ چنانچہ دیکھیے کہ ''بڑا جسم'' سے مراد جسامت میں بڑائی ہی کے ہوتے ہیں، اس سے مراد بڑی قدر و منزلت والے جسم کے نہیں ہوتے۔ اسی طرح ''بڑا گروہ'' سے مراد لوگوں کا وہی گروہ ہوتا ہے، جس میں لوگوں کی تعداد زیادہ ہو، اس سے کوئی ایسا گروہ مراد نہیں لیا جا سکتا جو اپنے مرتبے اور درجے کے اعتبار سے بہتر ہو۔ اس کے لیے ''بڑے لوگوں کا گروہ'' یا ''بڑی قدر و منزلت والا گروہ'' کہا جائے گا۔ بالکل اسی طرح، عربی زبان میں بھی 'السواد الاعظم' (بڑا گروہ) سے مراد وہ گروہ ہے، جس میں لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو۔ دوسرے معنی، یعنی بڑی قدر و منزلت والے گروہ کے لیے عربی زبان میں 'السواد أعظم درجة ومنزلة' یا اس سے ملتے جلتے الفاظ استعمال کیے جائیں گے۔

چنانچہ، مولانا کی یہ بات کہ 'السواد الاعظم' سے مراد تعداد میں بڑے ہونے کے بھی ہیں اور مرتبے اور درجے میں بڑے ہونے کے بھی ہیں، عربیت کی رو سے کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اب محولہ اقتباس میں مولانا محترم کی اصل بات کی طرف آیئے۔ مولانا نے اپنی اس بات (الجماعتہ سے مراد 'ما أنا علیه وأصحابی' ہے) کی بنیاد جس روایت پر رکھی ہے، وہ صحاح میں سے سنن ترمذی کی کتاب الایمان میں آئی ہے۔ مگر اس روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''الجماعتہ'' کی تعریف نہیں فرمائی، بلکہ التزام جماعت کا مسئلہ اصلاً وہاں زیرِ بحث ہی نہیں بلکہ اس میں اس سے ہٹ کر ایک دوسرے مسئلے کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے۔ روایت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم:
لیأتین علی أمتی ما أتی علی بنی اسرائیل

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری
امت بھی بعینہٖ وہی کچھ کرے گی، جو بنی اسرائیل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حذو النعل بالنعل حتى ان كان منهم من أتى أمه علانية لكان فى أمتى من يصنع ذلك و ان بنى اسرائييل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة و تفترق أمتى على ثلاث و سبعين ملة كلهم فى النار الا ملة واحدة قالوا ومن هى يا رسول الله قال ما أنا عليه وأصحابى.

(سنن الترمذی، کتاب الایمان)

نے کیا یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ایسا شخص تھا، جس نے کھلم کھلا اپنی ماں سے بدکاری کی، تو میری امت میں بھی ایسا کوئی شخص ہوگا۔ اور بنی اسرائیل بہتر مذہبی گروہوں میں بٹ گئے تھے، اور میری امت تہتر مذہبی گروہوں میں بٹ جائے گی۔ اور سوائے ایک کے ان میں سے ہر گروہ جہنم میں جائے گا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ، یہ کون سا گروہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ گروہ ہوگا، جو اس دین پر قائم رہے گا، جس پر میں اور میرے صحابی قائم ہیں۔‘‘

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس روایت پر غور کیجیے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ ’ما أنا عليه وأصحابى‘ والا حصہ ’’الجماعۃ‘‘ کے معنی بیان کر رہا ہے۔ ہمارے نزدیک ’’الجماعۃ‘‘ اور ’ما أنا عليه وأصحابى‘ کے الفاظ اگر اکٹھے بھی آئے ہوں، تب بھی دوسری تمام روایات کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ’’الجماعۃ‘‘ سے مراد ’ما أنا عليه وأصحابى‘ ہے۔

ان دونوں باتوں میں فرق اور ان کی الگ الگ اہمیت اور حیثیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات سمجھنی بہت ضروری ہے کہ امتِ مسلمہ میں تفرقے کی دو ہی بنیادی وجوہ ہوئی ہیں۔ ایک سیاسی بنیاد پر امت کا گروہوں میں بٹ جانا اور دوسرے مذہبی بنیاد پر الگ الگ گروہوں کا تشکیل پانا۔ ہمارے نزدیک، ’’التزامِ جماعت‘‘ کی ہدایت مسلمانوں کو سیاسی گروہ بندیوں سے اور ’ما أنا عليه وأصحابى‘ کی ہدایت انھیں مذہبی گروہ بندیوں سے بچنے کے لیے دی گئی ہے۔

چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے معنی، دراصل یہ ہیں کہ مذہب کے نام پر ہر ایسا گروہ جو میرے اور میرے صحابیوں کے عقیدہ و عمل سے ہٹ کر ہوگا، وہ گمراہی ہی کی دعوت لے کر اٹھے گا۔ اس وجہ سے مسلمانوں کو اپنے آپ کو کسی گروہ سے وابستہ کرتے ہوئے اس بات پر لازماً غور کرنا چاہیے کہ جس عقیدے اور عمل کی دعوت انھیں دی جارہی ہے وہ، دین کی حیثیت سے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں

کے ہاں پایا جاتا تھا یا نہیں۔ اگر یہ عقیدہ اور عمل، دین کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں پایا جاتا تھا، تو اسے اختیار کرنا ہی دین ہے۔ لیکن اگر اس کے برعکس اس عقیدہ و عمل کی کوئی شہادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے ہاں نہیں ملتی، تو یہ دین میں ایک ایسی اجنبی چیز ہے، جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دین میں ہر اضافہ بدعت، ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والے اعمال میں سے ہے۔ اس سے ہر عام و خاص کے ہاتھ میں ایک ایسی واضح میزان آجاتی ہے، جس پر وہ ہر عمل کو پرکھ کر اس بات کا بآسانی فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس عمل کی اسے ترغیب دی جا رہی ہے، وہ عمل کرنا درست بھی ہے یا نہیں۔

ہمارے نزدیک ''التزامِ جماعت'' اور 'ما أنا علیه وأصحابي' دو الگ الگ ہدایات ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق سیاسی لحاظ سے اپنے نظمِ اجتماعی سے جڑے رہنے کے ساتھ اور دوسرے کا تعلق مذہبی لحاظ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے نقشِ قدم پر چلنے کے ساتھ ہے۔

''الجماعۃ'' کو بیک وقت، ''اقامتِ دین کا فرض انجام دینے والی حکومت''، ''امتِ مسلمہ''، ''امت کا سوادِ اعظم (امت کی اکثریت)'' اور 'ما أنا علیه وأصحابي' قرار دینا، اور پھر یہ کہنا کہ افصح العرب نے اپنی یہ اصطلاح ان سبھی معنی میں استعمال کی ہے، بالکل درست معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا محترم کو اگر اپنی بات پر اصرار ہو، تو ہماری گزارش ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات میں ''الجماعۃ'' کی جگہ پر یہ سارے معنی رکھ کر ہمیں یہ سمجھائیں کہ اس کے نتیجے میں ان روایات کے کیا معنی بنتے ہیں۔

۸۔ اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد

مولانا محترم نے آٹھویں بات یہ فرمائی ہے کہ اگر اسلامی حکومت موجود ہی نہ ہو، تو پھر اس کے لیے منظم اور اجتماعی جدوجہد کرنا ایک دینی فریضہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جو جماعتیں، دین و شریعت اور سنتِ رسول اور سنتِ اصحابِ رسول کے اصول و ہدایات کے مطابق کام کر رہی ہوں، ان میں سے جس پر زیادہ اعتماد ہو، اس میں شمولیت اختیار کرنا اور اس کے نظم کا التزام کرنا، لازم ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

> ''آج پورے عالمِ اسلام میں اور ہمارے ملک پاکستان میں بھی ''الجماعۃ'' یعنی اقامتِ دین کا فرض انجام دینے والی اسلامی حکومت موجود نہیں ہے بلکہ ایسی حکومتیں قائم ہیں جو عملاً لادین سیاست کے اصول پر کام

کر رہی ہیں۔ تو کیا اس نظام کو بدلنے اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا امتِ مسلمہ پر فرض ہے یا نہیں؟ اگر فرض نہیں ہے، تو پھر طاغوت سے انکار، نہی عن المنکر اور جہاد سے متعلق آیات کا مفہوم کیا ہے؟ اور اگر فرض ہے اور یقیناً فرض ہے تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس فرض کی ادائیگی کے لیے انفرادی جدوجہد کافی ہے، یا اس کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنا ضروری ہے؟ میرے خیال میں اس سوال کا جواب ہر ایک کو معلوم ہے کہ ایک اجتماعی نظام کو مٹانے اور اس کی جگہ اسلام کا اجتماعی نظام لانے کے لیے اجتماعی جدوجہد کا نظام قائم کرنا ضروری ہے۔ اور اسی اجتماعی جدوجہد کے نظام کو جماعت اور تنظیم کہا جاتا ہے۔ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ فرض کا موقوف علیہ بھی فرض ہوتا ہے۔ لٰہذا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے دینی جماعتیں بنانا ضروری ہے۔'' (ماہنامہ ''فاران'' جون ۱۹۹۵ء، ص ۳۳)

مولانا محترم کی یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے کہ اگر ''اقامتِ دین'' کی جدوجہد کرنا فرض ہے تو پھر ہر ایسا انتظام جو اس جدوجہد کے لیے ناگزیر ہو، آپ سے آپ لازم ہو جائے گا۔ مگر ہمارا مولانا سے سوال یہ ہے کہ ''اقامتِ دین'' کے لیے ''جدوجہد'' قرآنِ مجید کی کس آیت کے تحت ''فرض'' ہوئی ہے؟

مولانا محترم مثبت طور پر اس بات کی کوئی دلیل دینے کے بجائے یہ فرماتے ہیں کہ اگر ''اقامتِ دین'' کی جدوجہد فرض نہیں ہے تو پھر طاغوت کے انکار، نہی عن المنکر اور جہاد سے متعلق آیات کا مفہوم کیا ہے؟ ہم افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ طاغوت کے انکار، نہی عن المنکر اور جہاد سے متعلق آیات کا ''اقامتِ دین'' کے لیے کسی جدوجہد کے ساتھ کوئی تعلق ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

''طاغوت سے انکار'' کے معنی شیطان کی پیروی کرنے سے انکار کرنے کے ہیں۔ قرآنِ مجید میں ''طاغوت'' کا لفظ خدا اور رسول کے مقابلے میں قائم ہونے والی عدالتوں کے لیے بھی آیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید سے زیادہ سے زیادہ جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ جب ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ ایک طرف اللہ کا قانون نافذ ہو اور دوسری طرف، اس کے مقابلے میں شیطانی نظام بھی کام کر رہا ہو، تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ''طاغوت سے اجتناب'' کریں۔ اس سے ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اللہ کا نظام جہاں نافذ نہ ہو، وہاں اس کے نفاذ کی جدوجہد ''طاغوت کا انکار'' کرنے کی آیت کے تحت فرض ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ''نہی عن المنکر'' کے معنی بری بات سے روکنے کے ہیں۔ یہ کام افراد کو اپنی سطح پر اور اجتماعیت کو اپنی سطح پر انجام دینا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''نہی عن المنکر'' کے الفاظ میں وہ کون سی چیز ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اگر اجتماعیت یہ کام انجام نہیں دے رہی، تو اس

اجتماعیت کو بدل کر ایک ایسی اجتماعیت کو بنانے کی جدوجہد کرنا ''فرض'' ہے، جو یہ کام انجام دے۔ مزید یہ کہ قرآنِ مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی روشنی میں، ایک عام آدمی کے لیے ''نہی عن المنکر'' اصلاً اپنے ماحول اور اپنے ملنے جلنے والوں میں حق اور حق پر ثابت قدمی کی خیر خواہانہ نصیحت کرنا ہے۔ جہاں تک جہاد و قتال کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی قرآنِ مجید سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کچھ شرائط پوری کرنے کے بعد، بعض صورتوں میں ایک اسلامی ریاست کے لیے مسلح اقدام کرنا جائز اور بعض صورتوں میں ضروری ہو سکتا ہے۔ اس سے بھی یہ بات کسی طرح نہیں نکلتی کہ اگر مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی جہاد نہیں کر رہا تو مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ انفرادی طور پر جہاد کے لیے نکل پڑیں یا ایسی حکومت قائم کرنے کی اجتماعی جدوجہد شروع کر دیں جو مولانا کے الفاظ میں اقامتِ دین کا فریضہ انجام دیتی ہو۔

دین و شریعت میں کسی چیز کو فرض، واجب یا نفل قرار دینا اللہ ہی کا کام ہے۔ پیغمبر کے بعد یہ کسی شخص کا مقام نہیں ہے کہ وہ اپنے قیاس و اجتہاد سے کسی چیز کو ''فرض'' قرار دے۔ دین میں کسی چیز کو غلط طور پر فرض، واجب یا مستحب قرار دینے سے دین کا مجموعی توازن بگڑ سکتا ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک، مولانا محترم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ قرآنِ مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں ایسی واضح نصوص کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں، جو ''اقامتِ دین'' کا ''فریضہ'' انجام دینے والی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کو فرض قرار دیتی ہیں۔ ظاہر ہے، اگر یہ جدوجہد مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ نے فرض ٹھہرائی ہے تو مولانا محترم کو کسی منطقی استدلال کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ انھیں دین کے ماخذ میں ایسی واضح اور قطعی نصوص مل جائیں گی، جن کے نتیجے میں ان کا مقدمہ آپ سے آپ ثابت ہو جائے گا۔ دین میں جو کچھ فی الواقع، فرض ہے، اس کی فرضیت کے بارے میں قرآنِ مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے واضح اور قطعی ارشادات موجود ہیں کہ ان ارشادات ہی کو نقل کر دینے سے ہر شخص پر ان معاملات کا لازمی ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ ''اقامتِ دین'' کرنے والی حکومت بنانے کی جدوجہد کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہو؟

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

محمد بلال

دانش سرا پاکستان کا دوسرا سالانہ اجتماع

(جاوید احمد صاحب غامدی کی افتتاحی تقریر)

—— ۱ ——

دانش سرا، پاکستان کا تین روزہ دوسرا سالانہ اجتماع ۱۲/ مارچ ۱۹۹۹ء سہ پہر ۴ بجے سے ۱۴/ مارچ سہ پہر ۳ بجے تک جاری رہا۔ یہ اجتماع جامع مسجد ای بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور کے سبزہ زار میں منعقد ہوا۔ مسجد کے احاطے میں واقع ایک اسکول کے کمروں میں دور دراز سے آنے والوں کے رہنے کا اور اسکول کے میدان میں طعام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مسجد کے سبزہ زار کے ایک حصے پر استقبالیہ اور ایک حصے پر کتابوں، درسِ قرآن و حدیث اور محاضرات پر مبنی آڈیو وڈیو کیسٹوں کی فروخت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سبزہ زار کے ایک بڑے حصے پر پنڈال لگایا گیا تھا۔ پنڈال میں بیٹھنے کے لیے کرسیوں کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خوب صورت بینروں کے پس منظر کے ساتھ اسٹیج کو اچھے طریقے سے سجایا گیا تھا۔ پنڈال کا ایک گوشہ خواتین کے لیے بھی خاص کیا گیا تھا۔ آواز دور تک پہنچانے کے لیے اسپیکرز وغیرہ کے لیے جدید آلات کا انتظام کیا گیا تھا۔

بہت سے افراد مقررہ وقت سے پہلے ہی اجتماع گاہ میں تشریف لا چکے تھے۔ اجتماع کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم فکر اور ہم مشن لوگ آپس میں ملیں۔ ایک دوسرے کا تعارف حاصل کریں۔ ایک دوسرے کے کردار، مساعی اور عزم وہمت سے روشنی پائیں۔ اپنے مسائل سے ایک دوسرے کو باخبر کریں۔ اپنے تجربات سے ایک دوسرے کو آگاہ کریں۔ اگر گلے شکوے ہوں تو وہ رو برو بیٹھ کر دور کر لیں۔ اپنے اندر اجتماعی سوچ پیدا کر لیں۔ جن کے اندر اجتماعی شعور ہے وہ اس شعور کو پختہ کر لیں۔ ''میں'' کی جگہ ''ہم'' کی حِس بیدار کر لیں اور ہم فکری

کو ایک حلقے میں اور ایک حلقے کو ایک خاندان میں تبدیل کر لیں۔

یہ کام اجتماع کے باقاعدہ آغاز سے قبل ہی شروع ہو گیا۔ میں جیسے ہی اجتماع میں داخل ہوا تو دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے بعض لوگوں سے تعارف حاصل ہوا۔ گفتگو شروع ہو گئی۔ جن لوگوں کو میں نے دیکھا بھی نہیں حتیٰ کہ نام سے بھی واقف نہیں تھا ان کے ساتھ ایک تعلق قائم ہو گیا۔ دوسرے دن وہ تعلق دوستانہ تعلق میں تبدیل ہو گیا اور تیسرے دن تو بعض لوگ بے تکلف دوست بن گئے۔ ایسے ہی خوش گوار تجربات دوسرے لوگوں کو بھی ہوئے۔

جس مسجد کے سبزہ زار میں اجتماع منعقد ہو رہا تھا اس میں ۴:۴۵ پر نمازِ عصر ادا کی گئی۔ اس کے بعد طعام گاہ میں چائے پی گئی۔ اس موقع پر بھی باہمی تعارف اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میں، بعض لوگ دانش سرا کے اہلِ علم سے دین سے متعلق سوال بھی پوچھ رہے تھے۔ نمازِ مغرب ادا کرنے کے بعد دانش سرا پاکستان اور اس اجتماع کے ناظم منظور الحسن صاحب نے اسٹیج سے اجتماع کے باقاعدہ آغاز کا اعلان کیا۔ اور چند افتتاحی کلمات ادا کرنے کے بعد افتتاحی تقریر کے لیے دانش سرا پاکستان کے صدر جاوید احمد صاحب غامدی کو دعوت دی۔

جاوید صاحب نے اپنی تقریر کے آغاز میں دور دراز سے آنے والے رفقاے عزیز کا شکریہ ادا کیا۔ انھیں خوش آمدید کہا۔ اور انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اتنا سفر کر کے یہاں آنے کی مشقت دین کی خاطر اٹھائی ہے۔ اس رشتے کی خاطر اٹھائی ہے جو ہمارے درمیان دین کی دعوت اور دین کی نصرت کے جذبے کے تحت پیدا ہوا ہے۔

اس کے بعد جاوید صاحب نے کہا کہ اجتماع کے انعقاد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دور دراز کے رفقا ایک دوسرے سے ملاقات کر لیں۔ آپس میں تبادلۂ خیالات کر لیں۔ اپنے تجربات سے دوسروں کو آگاہ کر لیں تاکہ پیشِ نظر کام بہتر طریقے پر ہو سکے۔

اس کے بعد جاوید صاحب نے اس بات کی وضاحت کی کہ ہمارے کام کی نوعیت کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ قرآن وسنت، تاریخ کے جید علماے دین اور صالحین کی طرزِ زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ دین کے تین کام ہیں۔ ایک یہ کہ جو دین وہ سمجھا ہے اسے اس کی اصل صورت میں، بے کم وکاست دوسروں تک پہنچا دے اور اس کے لیے زمانے کے حالات اور اپنی استطاعت کے لحاظ سے ابلاغ کے بہتر سے بہتر ذرائع اختیار کرے۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ جو اس سے وابستہ ہوں ان کی تربیت کرے۔ انھیں وہ اس بات کی ترغیب دے کہ جس بات کو وہ سمجھیں اسے اختیار کریں۔ان کی زندگی اس کا نمونہ بنے۔ جو روشنی انھوں نے حاصل کی ہے وہ ان کے پورے وجود سے منعکس ہو۔

تیسرے یہ کہ دین کے علم کی روشنی نسلاً بعد نسلٍ لوگوں کو منتقل کرنے کے لیے وہ اپنے جیسے علماے دین تیار کرے۔ ایسے علماے دین جو دین کو اس طرح سمجھتے ہوں کہ جیسے اسے سمجھنے کا حق ہے۔ وہ اصل ماخذ سے مراجعت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور پھر دنیا کی ہر مخالفت سے بے پروا ہو کر اسے آگے پہنچانے کی جرأت رکھتے ہوں۔

اس کے بعد جاوید صاحب نے اِن اصولی باتوں کی روشنی میں اپنے حوالے سے بات کی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے زمانے میں دینی اور دنیوی تعلیم میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔اس لیے علماے دین تیار کرنا ایک آسان کام تھا۔ لیکن جب سے تعلیمی نظام میں بگاڑ آیا ہے یہ کام مشکل ہو گیا ہے۔اس کے لیے میں نے کچھ ایسے نوجوانوں پر کام کیا جن کے اندر عالمِ دین بننے کی صلاحیت تھی۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا جب دین کے فکری ابلاغ کو تیز کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لٰہذا اس کام میں دلچسپی رکھنے والوں کے مابین ربط و نظام کی صورت پیدا کرنے کے لیے دانش سرا کا قیام عمل میں آیا۔

دانش سرا کے قیام کا پس منظر بڑے اختصار کے ساتھ واضح کرنے کے بعد جاوید صاحب نے اپنے کاموں کے حوالے سے اپنی بات کا رخ دین کے بنیادی مسئلے کی طرف کیا۔اس ضمن میں انھوں نے کہا کہ نفسِ انسانی دو ہی چیزوں کا مجموعہ ہے۔ایک علم اور دوسرے عمل۔اور دین کا بنیادی مقصد لوگوں کے علم و عمل کا تزکیہ ہے۔ پیغمبروں کی بعثت اس لیے ہوئی کہ وہ انسانوں کے علم و عمل کا تزکیہ کریں۔ جس بات کو وہ اپنا بنیادی مسئلہ بنا کر کام کرتے تھے وہ یہی کام تھا۔ یہی کام ان کی دعوت کا مرکز و محور تھا۔ یہی کام ان کا اصلاً نصب العین تھا۔

انھوں نے کہا کہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا انسان کی آزمایش کے لیے بنائی ہے۔ خدا یہ پرکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون سے انسان ہیں جو اپنے علم و عمل کا تزکیہ کرتے ہیں۔ تاکہ ان انسانوں کا انتخاب کر کے اس دنیا کو آباد کیا جائے جو قیامت کے بعد وجود پذیر ہونے والی ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں بعض فکری تحریکوں کی وجہ سے دین ایک خارج کا معاملہ بن کر رہ گیا ہے۔اس کے اہداف باہر قائم ہو گئے ہیں۔انھوں نے کہا کہ کوئی خاص حکومت قائم ہو جائے، وہ دنیا پر اپنا غلبہ قائم کر دے۔ یہ چیزیں دین میں بالکل ضمنی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم

نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ دین کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ دین کا اصل مسئلہ تزکیہ حاصل کرنا ہے۔ یہ بات سب سے اہم ہے۔ یہ بات سب سے زیادہ بتانے کی ہے۔ یہ بات سب سے زیادہ سمجھانے کی ہے۔ یہ بات سب سے زیادہ پھیلانے کی ہے۔ یہ بات لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کرنے اور دلوں میں اتارنے کی ہے۔ اس کے بغیر دین کی سب باتیں ہوں گی لیکن ان کا رخ صحیح متعین نہیں ہو گا۔

تزکیہ کے حوالے سے جاوید صاحب نے تصوف کے فکر و فلسفہ پر تنقید بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ تزکیہ کا لفظ چونکہ اربابِ تصوف بھی استعمال کرتے ہیں اس لیے ہم نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی کہ یہ محض لفظی اشتراک ہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے تزکیہ اور تصوف کے تزکیہ میں کوئی قدر مشترک تلاش نہیں کی جاسکتی۔

انھوں نے کہا کہ رفقاے عزیز اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ بنیادی بات ہے۔ اگر اس بات کو ٹھیک طریقے سے نہ سمجھا گیا تو دین کے سب کام ہوں گے لیکن ان کی سمت غلط ہو گی۔

جاوید صاحب نے کہا کہ ہم نے کوشش کی کہ لوگوں کے سامنے دین کے مطالبات ٹھیک اس طرح پیش کریں جس طرح انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین کیا۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جا رہا تھا کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب کچھ کر لیں۔ دین کی دعوت کا کام کر لیں۔ لیکن جب تک کوئی شخص کسی ''الجماعۃ'' میں شامل نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا اس نے دین کا کوئی مطالبہ پورا نہیں کیا۔

ہم نے لوگوں پر واضح کیا کہ اس طرح کا کوئی مطالبہ دین کے اندر موجود نہیں ہے۔ بعض روایات کا مدعا صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے دین میں ایک باطل چیز داخل ہو رہی ہے۔ ہم نے لوگوں کو بتایا کہ ''الجماعۃ'' پاکستان میں قائم ہے۔ دنیا کے پچاس پچپن ممالک میں قائم ہے۔ ''الجماعۃ'' کا مطلب مسلمانوں کی ریاست ہے۔ نہ کہ عام گروہ، پارٹیاں اور جماعتیں۔

اس ضمن میں ہم نے لوگوں کو اس بات سے آگاہ کیا کہ دین کی خدمت کرنے والے اہلِ علم سے لوگوں کے تعلق کی نوعیت پیر اور مرید کی اور امیر اور مامور کی نہیں ہے۔ اللہ اور رسول کی تعلیم کے مطابق اس تعلق کی نوعیت معلم اور متعلم کی ہے۔ عالمِ دین سکھاتا اور دوسرا سیکھتا ہے۔ اللہ کے رسول کے ساتھی ''صحابی'' کہلاتے تھے۔ یعنی صحبت اٹھانے والے۔ پاس بیٹھنے والے۔ سیکھنے والے۔ عربی زبان کی تعبیر کے مطابق ملازمت کرنے والے۔

پیری مریدی کے تعلق میں القا و الہام کے دعوے کیے جاتے ہیں۔ ''الجماعتہ'' کے غلط تصور سے امت تفرقوں کا شکار ہوتی ہے۔ لہٰذا جاوید صاحب نے اس ضمن میں کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی شخص القا و الہام کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کوئی شخص رسول اللہ کی امت میں مزید کوئی امت نہیں بنا سکتا۔ اس امت میں انتشار پیدا نہیں کر سکتا۔

پیری مریدی میں ''مریدوں'' اور ''الجماعتہ'' کے غلط تصور کے تحت بننے والی جماعتوں میں ''مامور'' لوگوں کی حیثیت ''غلاموں'' کی سی ہوتی ہے۔ لہٰذا جاوید صاحب نے اپنے کام کے ایک نتیجے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے انسانوں کو انسانوں کے نہاب سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ ہم نے لوگوں کو تعلیم دی کہ وہ عالمِ دین کو ایک استاد کا مقام دیں۔ اس کے نتیجے میں احترام کا جذبہ آپ سے آپ پیدا ہو جائے گا۔

جاوید صاحب نے واضح کیا کہ دین کے کاموں میں اصل اساس کی حیثیت جذبۂ نصرت کو حاصل ہے۔ جب کسی شخص کو یہ معلوم ہو کہ فلاں عالمِ دین کی فکر صحیح ہے۔ اس کے ساتھی قابلِ اعتماد ہیں۔ تو اس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس عالمِ دین کی اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق مدد کرے۔ انھوں نے استطاعت اور استعداد کے الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مدد کرنے والے لوگوں سے ان کی استطاعت اور استعداد کے مطابق ہی کام لینے کی بیعت لیا کرتے تھے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ کام لینے والے طے کریں کہ کیا کرنا ہے بلکہ صورتِ حال یہ ہو گی کہ دین کا مطالبہ واضح کر دیا جائے گا پھر کام کرنے والے اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق تعاون کریں گے۔ یہ واضح رہے کہ دین کی نصرت گلے کا طوق نہیں ہے۔ کوئی فدائی بننا نہیں ہے۔ ایک مخصوص پس منظر کی وجہ سے اس مسئلے کی تنقیح کے لیے ہمیں بہت سعی و جہد کرنی پڑی۔

اس ضمن میں لوگوں کو اس طرف بھی متوجہ کیا کہ دین کا ماخذ صرف نبی صلی اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی ہے۔ ہم لوگ جو کچھ پیش کرتے ہیں اپنے غور و فکر کی بنیاد پر پیش کرتے ہیں۔ اس میں غلطی ہو جائے تو اعتراف کر لیتے ہیں۔ ابہام ہو تو اسے نشان زد کر دیتے ہیں۔ اشکال ہو تو اسے واضح کر دیتے ہیں۔ ہر جگہ، ہر نج کی مجلس میں، ہر اجتماع میں لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جب آپ کوئی فکر اختیار کریں تو اس کے ساتھ فطری عصبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے امام شافعی کا یہ قول ہر وقت ذہن میں رکھیں کہ ''میں اپنی بات صحیح سمجھتا ہوں لیکن اس میں غلطی کا امکان تسلیم کرتا ہوں۔ اور دوسروں کی بات کو غلط کہتا ہوں مگر اس میں صحت کا امکان تسلیم کرتا ہوں۔''

اس طرح ہم نے لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی جو تعبیر اختیار کر لی گئی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اسلام موجودہ صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ دین ہے۔ اس کی کتاب قرانِ مجید بالکل محفوظ ہے۔ کبھی ایک دن کے لیے ایسا نہیں ہوا کہ یہ کتاب گم ہو گئی ہو یا اس کا کوئی حصہ ضائع ہو گیا ہو یا اس کے علم و عمل میں کوئی انقطاع آگیا ہو۔ قرآن کے عجائب سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوتے رہتے ہیں۔ انتہائی انحطاط کے دور میں بھی اس کے بہترین خدام پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند ہی کو لیں۔ اس میں مسلمانوں کے دورِ زوال میں بھی قرآن کے ایسے ایسے خدام پیدا ہوئے ہیں کہ جن کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ لہٰذا اسلام زندہ ہے۔ اپنے پیغمبر کی تاریخ اور سیرت کے ساتھ زندہ ہے۔ اس کے اوپر کبھی ایسا زمانہ نہیں آیا جب اس کے احیا کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ اسے کسی نشاۃ ثانیہ کی ضرورت پیش آئی ہو۔ اسے کبھی بازیافت کی ضرورت لاحق ہوئی ہو۔

اسی طرح دین اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی ہمیشہ واضح رہا ہے۔ صحیح دین ایک تسلسل سے اپنی روح کے اعتبار سے جاری رہا۔ اگر اس میں کوئی بدعت داخل کی گئی یا کوئی انحراف کیا گیا تو ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو بتا دیتے تھے کہ یہ بدعت ہے۔ یہ انحراف ہے۔ یہ گریز ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لہٰذا اسلام زندہ ہے۔ زندہ رہا ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔ ہاں نشاۃ ثانیہ کا مسئلہ مسلمانوں سے متعلق ہے۔ مسلمان کبھی سرفرازی کے مقام پر تھے۔ انھوں نے دنیا پر حکومت کی اور ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ پھر انھیں زوال آیا۔ انھیں اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انھیں زندہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلام کو اپنانے والے سوتے بھی ہیں۔ گرتے بھی ہیں۔ مرتے بھی ہیں۔ ان کے احیا کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ اس پہلو سے اسلام اور مسلمانوں میں فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ دعوتِ دین کے پہلو سے ہم نے لوگوں پر یہ حقیقت بھی بار بار واضح کی کہ جو شخص قومی سطح پر یہ کام کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کی رو سے پہلے دین کے علم میں بصیرت حاصل کرے۔ وہ مسیح علیہ السلام کے قول کے مطابق اندھا راہ بتانے والا نہ بنے۔ دین کا علم اس طرح حاصل کرے جیسے دین کا علم حاصل کرنے کا حق ہے۔ قرآن کی زبان، قرآن کے ادب، نبی کی سنت اور دینی علوم کے پس منظر سے خوب اچھی طرح واقف ہو۔ اور جو دین دوسروں تک پہنچائے وہ ہر غبار سے پاک ہو۔

دعوتِ دین ہی کی جہت سے جاوید صاحب نے مزید کہا کہ دعوت کا کام کرتے ہوئے لوگ بڑے بڑے

منصوبے بناتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیں آپ پر اپنے گھر والوں کا، اپنے ماحول کا اور اپنے بچوں کا زیادہ حق ہے۔ اپنے بیوی بچوں کے معاملے میں حساس رہیے۔ حق کا چراغ ان کے دلوں میں بھی جلائیے۔ ان کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔

انھوں نے کہا کہ آدمی کا ماحول کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ آدمی اپنے ماحول میں جیتا بستا ہے۔ وہ ماحول جہاں اس کا علم وعظ نہیں بلکہ عمل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لہٰذا اپنے ماحول میں زیادہ کام کریں مگر اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق۔

یہ ہمارے وہ کام تھے جو علم کے تزکیے کے باب میں کیے گئے۔ علم کا تزکیہ ہو جائے تو عمل کا تزکیہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد جاوید صاحب نے کہا کہ یہ تینوں کام ہم نے بتدریج کیے۔ پہلے میری دلچسپی کا موضوع اصلاً دو چیزیں بنیں۔ ایک دین کے علم میں جو غلط باتیں در آئی تھیں ان کی اصلاح۔ دوسرے دین کے علما کی تیاری۔ اس میں بھی توجہ کبھی ایک طرف زیادہ ہو جاتی تھی اور کبھی دوسری طرف۔

اب میری توجہ عملی تربیت کی جانب ہوئی ہے۔ عملی تربیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن صالحین کی صحبت اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ صحبت کی بے پناہ تاثیر ہوتی ہے۔ اچھے ماحول سے دلوں کا زنگ اترتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو ایسا ماحول مہیا کیا جائے جہاں ان کو اپنی اصلاح کرنے کا موقع ملے۔ نبیوں کے کاموں میں اس کو ہمیشہ بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہمیں بھی اسے اہمیت دینا ہوگی۔

جاوید صاحب نے عملی تربیت کے کام کے لیے ادارے کی ضرورت واضح کرنے کے لیے دورِ نبوی کا دورِ حاضر سے موازنہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ دورِ نبوی میں یثرب ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ایک آدمی پیدل چل کر اس بستی سے نکل سکتا تھا۔ موجودہ مسجدِ نبوی ٹھیک اسی رقبے پر بنی ہے جس پر اُس وقت مدینہ کی پوری آبادی تھی۔ اس بستی میں لوگوں سے رابطہ رکھنا، ان کی تربیت کرنا، انھیں ایک مسجد میں جمع ہونے کا موقع دینا، بہت آسان تھا۔ لیکن آج ہمارے ملک کی آبادی کروڑوں پر مشتمل ہے۔ اس شہر کی آبادی پچاس لاکھ ہے۔ چھوٹے چھوٹے محلوں میں سب افراد کی ذمہ داری ایک شخص نہیں اٹھا سکتا۔ لہٰذا جس طرح دین کی تعلیم کے لیے اداروں کی ضرورت ہے اسی طرح دین کی تربیت کے لیے بھی اداروں کی ضرورت ہے۔ خانقاہ کا ادارہ ہمارے ہاں تصوف کی وجہ سے بدنام ہو گیا ورنہ عملی تربیت کے لیے ایسے اداروں کی بہت ضرورت ہے۔ لوگ دنیا کی ہماہمی میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دین کے مطالبات بھلا بیٹھے ہیں۔ ان کے دلوں پر کچھ زنگ لگ جاتا ہے۔ معاشی جدوجہد، خاندان کے مسائل، زندگی کے نشیب و فراز دین سے دور کر دیتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ایسے اداروں کی ضرورت ہے جہاں لوگ آکر صالحین کی صحبت میں، اہلِ علم کی صحبت میں کچھ وقت گزاریں۔

جاوید صاحب نے ''المورد'' کے حوالے سے کہا کہ دینی علوم کی درس گاہ بن گئی ہے۔ یہاں پڑھنے والوں سے ہمارا یہی مطالبہ ہے کہ وہ دین کے جید عالم بنیں۔ فرقہ بندیوں سے بلند ہو کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین کے علم بردار بنیں۔ وہ جو علم حاصل کریں اس کی روشنی میں اپنے سفر کی ابتدا کریں۔

دعوت کے عملی پہلو کے حوالے سے جاوید صاحب نے کہا کہ دعوت کا نظام بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اس نظام میں اللہ کے کچھ بندے اپنی زندگی لگا کر اس کی کوشش کر رہے ہیں دین کے علم کا ابلاغ کیا جائے۔

اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کے لیے تربیت گاہ بنے۔ آپ بھی اس پر غور کریں۔ میں بھی اس پر غور کر رہا ہوں۔ آپ اس میں کیا تعاون کر سکتے ہیں۔ کیا قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں بتائیں۔ اپنی تجاویز دیں۔ میں ان پر غور کروں گا۔

انھوں نے کہا کہ تربیت گاہ کے بننے سے ہمارے کام کے اجزا مکمل ہو جائیں گے۔ ورنہ ہمارے کام میں اس کمی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ دین کا علم تو ہم سے حاصل کریں گے مگر باقی ضرورتیں دوسروں کے پاس جا کر پوری کریں گے۔ اس سے اندیشہ ہے کہ کوئی نہ کوئی ان کے علم و فکر کی عمارت میں بھی نقب لگا لے گا۔ میں یہ مسئلہ آپ کے سامنے ایک بہت اہم مسئلے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ اس میں آپ جو سوال کرنا چاہیں میں اس کے لیے بہت سا وقت صرف کرنے کے لیے تیار ہوں۔

(جاری)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

''اشراق'' کے نام خطوط میں پوچھے گئے
سوالات پر مبنی مختصر جوابات کا سلسلہ

قرآن میں تضاد؟

سوال: قرآنِ مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ فیصلہ کن کتاب ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر اس میں متضاد باتیں کیوں ہیں۔ مثلاً ستاروں کو سجدہ کرنے سے روکا بھی ہے اور حضرت یوسف کو ستارے سجدہ بھی کرتے ہیں۔ ایک جگہ خدا کے بارے میں ارشاد ہے کہ 'لیس کمثلہ شیء' اور دوسری جگہ اللہ کے ہاتھوں کا ذکر ہے جو کشادہ ہیں۔ سورۂ بقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس فرشتہ تھا اور سورۂ کہف میں بتایا گیا ہے کہ وہ جن تھا۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ رازق اللہ تعالیٰ ہے لیکن سورۂ توبہ میں ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے منافقین کو اپنے فضل سے غنی کر دیا۔ ان مقامات کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ (سید بلیغ الدین، کراچی)

جواب: قرآنِ مجید حتمی کتاب ہے اور یہی فیصلہ کن ہے۔ یہ بات خود قرآنِ مجید میں قرآن کے نزول کے ایک مقصد کی حیثیت سے بیان ہوئی ہے۔

قرآن میں کوئی تضاد نہیں ہے اور نہ ایسا ممکن ہے۔ اس لیے کہ ایک مصنف کی باتیں علم کی کمزوری ہی کی وجہ سے مختلف ہو جاتی ہیں۔ قرآن اس ہستی کی کتاب ہے جو ہر کمزوری سے بالا اور پاک ہے۔ آپ نے جن مقامات میں تضادات محسوس کیے ہیں۔ ان کی وضاحت حسبِ ذیل ہے:

۱۔ حضرت یوسف کو ستاروں کا سجدہ کرنا اور تمام اجرامِ فلکی کا خدا کے آگے سر بسجود ہونا باہم دگر متضاد نہیں ہیں۔ بے شک انبیا کا خواب سچا ہوتا ہے لیکن اس میں جو واقعات دکھائے جاتے ہیں وہ حقیقی بھی ہوتے ہیں اور

تمثیلی بھی۔ حضرت یوسف کو جو واقعہ دکھایا گیا اس کی نوعیت تمثیلی ہے۔

۲۔ ''خدا کے ہاتھ کھلے ہیں'' کی ترکیب میں ہاتھ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے۔ یعنی اس سے کوئی عضو مراد نہیں ہے۔ جس طرح اردو میں ہاتھ تنگ ہونا مالی حالت کو بیان کرتا ہے اسی طرح یہ عربی میں بھی اسی معنی میں آیا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ آیت 'لیس کمثلہ شیء' سے متضاد نہیں ہے۔

۳۔ ابلیس جنات ہی میں سے تھا۔ سورۂ بقرہ میں عدمِ ذکر ہے۔ سورۂ کہف میں تصریح ہے۔ تضاد تو تب تھا کہ سورۂ بقرہ میں فرشتہ قرار دینے کے الفاظ موجود ہوتے۔

قادرِ مطلق

سوال: اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ اس کی قدرت رکھتے ہیں کہ ایسا پتھر بنائیں جسے اٹھا نہ سکیں۔ کسی کو اپنی کائنات سے باہر نکال دیں۔ دو اور دو کا پانچ بنا دیں یا خودکشی کر لیں؟ (صدیق رضا، کراچی)

جواب: اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو بھی کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

آپ نے جو کام اللہ تعالیٰ سے کرانے کی بات کی ہے، اس میں سوال قدرت کا نہیں ہے۔ مثلاً بھاری اور ہلکے کا تصور کششِ ثقل سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے، خدا کی نسبت سے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

خدا کی بادشاہی کیا ہے؟ کائنات کی حدود کیا ہیں؟ یہ ساری باتیں ہمارے تصور سے ماورا ہیں۔ جب تک ہمیں ان کا حقیقی فہم حاصل نہ ہو، اس وقت تک یہ سوالات ایک دو سال کے بچے کے سوالات کی طرح ہیں جو اپنے والدین سے بچے کے پیدا ہونے کا عمل جاننا چاہتا ہے۔

دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے اور اتنا قوی اور یقینی ہے کہ ہم اس کے خلاف ہر جواب کو غلط قرار دیتے ہیں۔ اس کا قدرت سے کیا تعلق؟ کیا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ جب بھی دو اور دو چیزیں اکٹھی رکھیں تو وہ اس میں پانچویں رکھ دے؟

اللہ تعالیٰ کا غیر مخلوق ہونا اور اس کی زندگی اور عدمِ موت کا تصور، ہمارے لیے خاص معنی کا رکھتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ غیر مخلوق ہے تو یہ صرف اس چیز کی نفی ہے کہ اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ اسی طرح اس کی زندگی سے مقصود درحقیقت اس کے ہمیشہ رہنے کو بیان کرنا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ ہم اس کی ذات کی حقیقت سے واقف نہیں۔ جب ہم اس کی ذات ہی سے آگاہ نہیں ہیں تو یہ سوالات بھی بے معنی ہیں۔

اصل میں، ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہم کیا جان سکتے ہیں اور کیا نہیں جان سکتے۔ جب یہ بات واضح ہو جائے تو پھر ہمیں اس دائرے تک محدود ہو جانا چاہیے جو ہمارے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔

زیورات کی زکوٰۃ

سوال: میری شادی شعبان میں ہوئی ہے۔ کیا اس رمضان میں شادی کے موقع پر (بری اور جہیز) کے زیورات کی زکوٰۃ ادا کروں گا۔ کیا کچھ زیورات زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں؟ کیا نصاب بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہو گا؟ کیا میں اپنی بیوی کی ملکیت کے زیورات کی زکوٰۃ دوں گا؟ (ظفر حسین، چکوال)

جواب: زکوٰۃ کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت سال میں ایک مہینا مقرر کر دے اور اگر حکومت زکوٰۃ وصول نہ کرتی ہو تو فرد مقرر کر لے اور اس مہینے کے آنے پر جو رقم یا مال موجود ہو اس پر زکوٰۃ ادا کرے۔ اس قاعدے کے مطابق اگر آپ نے رمضان کا مہینا مقرر کر رکھا ہے تو آپ شعبان تک حاصل ہونے والے مال کی بھی زکوٰۃ ادا کریں گے۔

زیورات میں سے وہ زیور زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں جو خواتین عام طور پر استعمال کرتی ہیں۔ مثلاً ہر وقت کانوں میں رہنے والے کانٹے یا پہنی جانے والی انگوٹھی وغیرہ۔

نصاب زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں دو آرا ہیں۔ بعض علما نصاب کو مستثنیٰ قرار دیتے ہیں اور بعض اسے شامل کر کے زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ میرا رجحان دوسری رائے کے حق میں ہے۔

زکوٰۃ ادا کرنے کی ذمہ داری اصولاً تو اسی کی ہے جو مال کا مالک ہے۔ اس لحاظ سے بیوی اپنے ملکیتی زیورات کی زکوٰۃ ادا کرنے کی مکلف ہے اور شوہر اپنے ملکیتی زیورات کی۔ لیکن وہ خواتین جو کماتی نہیں ہیں ظاہر ہے، وہ یہ زکوٰۃ شوہر کی آمدنی ہی سے ادا کریں گی۔ اگر شوہر یہ زکوٰۃ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عورت زیور کا کچھ حصہ بیچ کر زکوٰۃ ادا کرے۔

دینی جماعتوں کا وجود

سوال: مختلف دینی جماعتوں کی موجودگی میں عام آدمی کیا کرے۔ کیا ایک عام آدمی صحیح رائے تک پہنچ سکتا ہے؟ (الطاف احمد، کراچی)

جواب: دینی جماعتوں کے حوالے سے آپ کا بیان درست ہے، لیکن ان کی موجودگی سے جو مشکل پیدا

ہوئی ہے اس کی حقیقت وہ نہیں جو آپ نے بیان کی ہے۔

کوئی عام آدمی دینی و فکری اعتبار سے کسی خلا میں نہیں ہوتا۔ وہ اپنے والدین یا اساتذہ سے کوئی فکر لے کر اور اسے اپنا کر جی رہا ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق عمل کرے اور اپنے نقطۂ نظر پر ہونے والی تنقید کا بے تعصبی سے جائزہ لیتا رہے۔ جہاں اسے معلوم ہو کہ اس نے جو بات مانی ہوئی تھی اس کے درست ہونے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہی وہ اپنی رائے تبدیل کر لے۔ یہ عمل ہر عام آدمی بہت آسانی سے کر سکتا ہے اور اس سے نہ اس کی اپنی زندگی میں اور نہ معاشرے میں کوئی علمی یا عملی خلفشار پیدا ہوتا ہے۔

ہماری یہ تمنا کہ تمام مسلمان ہم فکر ہوں، کوئی دوسرے سے اختلاف نہ کرے کبھی نہ پوری ہونے والی تمنا ہے۔ اس لیے کہ جب تک انسان پیدا ہوتے رہیں گے سوچنے کا عمل جاری رہے گا۔ نئی آرا قائم ہوتی رہیں گی۔ چنانچہ نئے نئے گروہ وجود میں آتے رہیں گے۔ سارے انسان ایک رنگ میں رنگ جائیں یہ آمریت خدا نے قائم نہیں کی۔ کسی آدمی یا کسی فکر کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ یہ آمریت قائم کر دے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

'توام' کے معنی

سوال: توام کے کیا معنی ہیں۔ جاوید احمد صاحب غامدی نے اپنی تفسیر ''البیان'' میں یہ لفظ کس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اختیار کیا ہے؟ (محمد اسرار اللہ، پشاور)

جواب: 'توام' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی جوڑے کے ہیں۔ جاوید صاحب نے یہ لفظ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اختیار کیا ہے کہ قرآنِ مجید کی ہر دو سورتیں اپنے مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں یا ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

قرآنِ مجید نے اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے 'مثانی' کا لفظ اختیار کیا ہے۔ مثانی جمع ہے اور اس کا واحد مثنیٰ ہے۔ اس کے معنی بھی جوڑے کے ہیں۔

قرآنِ مجید کی تمام سورتیں ایک دو استثنا کے سوا اسی طرح جوڑا جوڑا ہیں۔ اس کی واضح ترین مثالیں معوذتین اور بقرہ اور آلِ عمران کے جوڑے ہیں۔

ایک روایت پر اعتراض

مدیر ماہ نامہ ''اشراق'' لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

محترم محمد بلال صاحب نے جنوری ۱۹۹۹ء کے شمارہ، صفحہ ۲ پر ایک حدیث کا ترجمہ لکھا ہے کہ :

''بدعتی کی تمام عبادات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وانفاق قبول نہیں ہوتیں۔ بدعتی اسلام سے ایسے خارج ہو جاتا ہے جیسے گندھے ہوئے آٹے سے بال نکل جاتا ہے۔''

میں بحمد اللہ تعالیٰ مبتدع نہیں ہوں اور میں مبتدعین کی وکالت بھی نہیں کرتا لیکن علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ یہ روایت موضوع ہے، اگرچہ اکثر اہلِ حق مبتدعین کی مذمت اور بدعت کی قباحت اسی روایت سے ثابت کرتے ہیں۔

یہ روایت دراصل ابنِ ماجہ کی ہے اور اس کے عربی الفاظ یہ ہیں:

لا يقبل الله لصاحب بدعة صوما ولا صلاة، ولا صدقة، ولا حجا ولا عمرة، ولا جهاداً، ولا صرفاً ولا عدلاً، يخرج من الاسلام كما تخرج الشعرة من العجين.

(حدیث ۴۹، المقدمہ، باب ۷)

اس کا مرکزی راوی محمد بن محصن ہے جس کے متعلق امام بخاری فرماتے ہیں:

''منکر احادیث بیان کرتا تھا۔'' (التاریخ الکبیر ۱: ۴۰، ترجمہ ۶۳)

امام ابنِ ابی حاتم فرماتے ہیں:

"مجہول وکذاب تھا اور مکذوب و موضوع روایات نقل کرتا تھا۔" (الجرح والتعدیل ۷: ۱۹۴-۱۹۵)

"امام اوزاعی اور دیگر ثقہ راویوں کے نام لے کر من گھڑت احادیث بیان کیا کرتا تھا۔"

(المدخل ای الصحیح ص: ۲۰۰، المجروحین ۲: ۲۸۴)

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بدعتی، اسلام سے بالکل خارج ہو جاتا ہے۔ تو کیا ہم بھی مبتدعین کو بالکل خارج از اسلام یعنی کافر و مرتد ہی جانیں۔

براہِ کرم اس سلسلہ میں میری رہنمائی فرمائیے۔

بدعت کی مذمت میں ابنِ ماجہ ہی کی ایک روایت یہ بھی ہے:

ابی اللّٰہ ان یقبل عمل صاحب بدعة حتی یدع بدعته.	"اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اس وقت کہ وہ اپنی بدعت کو ترک نہ کر دے۔"

(ابنِ ماجہ ۵۰ تاریخ بغداد ۱۳: ۱۸۶: السنتہ لابن ابی عاصم ۱: ۲۲)

لیکن اس روایت کی اسنادی حیثیت بھی کچھ بہتر نہیں۔

۱۔ اس کا ایک راوی عبد اللہ بن سعید المقبری المدنی واہی تباہی ہے۔ (الکاشف للذہبی ۲: ۲۹۲)

۲۔ ایک راوی بشر بن منصور کے متعلق جرح و تعدیل کے علما بالکل ساکت ہیں، وہ صرف ان کا نام لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۳۔ ایک راوی ابو زید مجہول ہے۔ (الکاشف ۳: ۳۳۸)

۴۔ ایک راوی ابو المغیرہ بھی مجہول ہے۔ (الکاشف ۳: ۳۸۰)

براہِ کرم "اشراق" کی اس سلسلہ میں جو بھی رائے ہو وہ "اشراق" ہی کے صفحات پر شائع کریں۔ آپ میری گفتگو کو مناظرہ نہ سمجھیے گا۔ کیوں کہ میں بدعتی نہیں ہوں اور نہ ان کی صفائی پیش کرتا ہوں۔ صرف 'الدین النصیحة باللّٰہ ولرسول ولائمته المسلمین وعامتهم' کے پیشِ نظر یہ چند سطور حوالۂ قرطاس کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ ان کا برا نہ مانیں گے۔

فقط والسلام ورحمۃ اللہ

ابو سلمان عفا اللہ عنہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

۵ فروری ۱۹۹۹

مردان

محترم ابو سلمان سراج الاسلام صاحب حنیف

السلام علیکم

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

محمد بلال صاحب کی جس تحریر پر آپ نے بات کی ہے اس میں انھوں نے مذکورہ روایت کی بنا پر کوئی استدلال نہیں کیا تھا۔ اور وہ کوئی تحقیقی مضمون بھی نہیں تھا۔ اس میں انھوں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ... اس طرح انھوں نے وہ روایت درج کر دی جس پر آپ نے تنقید کی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو وہ ایک بیانِ واقعہ ہے۔

اس روایت پر سند کے پہلو سے آپ کا اعتراض بجا ہے۔ بدعت کے حوالے سے وہی حدیث قابل اعتماد ذرائع سے پہنچی ہے جس میں ہر بدعت کو ضلالت قرار دیا گیا ہے۔ اور ہر ضلالت کو جہنم میں لے جانے والی کہا گیا ہے۔ اور اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کہی گئی۔

ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری ایک غلطی کی نشان دہی فرمائی۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے۔

دعا کا طالب

معز امجد

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نعیم احمد بلوچ

احمد جاوید صاحب سے ایک مکالمہ

''ملاقات'' کے اس سلسلے کا مقصد قارئینِ ''اشراق'' کو اہم شخصیات کے خیالات سے انھی کی زبانی آگاہ کرنا اور دین پر غور و فکر کے دوسرے زاویوں سے باخبر رکھنا ہے تاکہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اور بغیر کسی تعصب کے مذہبی آرا کی صحت اور عدمِ صحت کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ان شخصیات کے خیالات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ مدیر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

''حقیقتِ تزکیۂ نفس'' ایک پمفلٹ ہے۔ اسے ڈاکٹر محمد امین صاحب نے تحریر کیا ہے۔ ہم نے تبصرے کی غرض سے اس کا مطالعہ کیا۔ اس پمفلٹ کا پیش لفظ بڑا چونکا دینے والا تھا۔ تصوف کے حوالے سے ایک ایسے شخص کی رائے تھی جو خود صوفی بھی ہیں اور تصوف کے علمی پس منظر سے بخوبی آگاہ بھی۔ ان کی طرف سے یہ رائے واقعی قابلِ غور تھی۔

''اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ بدعقیدگی اور بے عملی کی کوئی بھی قسم ہو، یہ ممکن نہیں کہ اس کے ڈانڈے تصوف سے نہ ملتے ہوں۔ اور یہ شاخسانہ ہے شخصیت پرستی، خود نمائی اور حبِ دنیا کا جن کی بنیاد پر متداول تصوف کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ ان حالات میں اہلِ علم اور مردانِ عمل کی یہ ذمہ داری تھی کہ تصوف میں اور تصوف سے پیدا ہونے والے فساد کا بروقت ادراک کرتے اور اس کے اثرات کے مختلف طبقات میں پھیلنے سے روکنے کی عملی کوشش کرتے.....''

یہ جناب احمد جاوید کے خیالات تھے جو اقبال اکیڈیمی میں ریسرچ انوسٹی گیٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کے

یہ خیالات ہی ان سے ملاقات کا محرک بنے۔ ہم نے سوچا کہ تصوف کے حوالے سے احمد جاوید صاحب سے بڑی چشم کشا گفتگو ہو سکتی ہے، چنانچہ ہم نے انھیں ''اشراق'' کے لیے کچھ وقت نکالنے کی درخواست کی۔ ہماری دعوت انھوں نے قدرے پس و پیش کے بعد قبول کر لی اور آخر کار ان سے ملاقات کا دن آ ہی گیا اور وہ ہماری گزارش پر ''اشراق'' کے دفتر تشریف لے آئے۔ اس مکالمے میں طالب محسن صاحب اور محمد بلال صاحب بھی شریک ہوئے۔

پہلا سوال طالب محسن صاحب نے کیا۔ ''دین کی طرف آپ کا رجحان کیسے ہوا؟''

''میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جہاں جدید تعلیم بہت پہلے سے تھی۔ میرے دادا الٰہ آباد میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ ان کے والد اور چچا بھی جدید تعلیم سے آراستہ تھے۔ اس جدید تعلیم کے ہمراہ کوئی دینی تعلیم نہیں دی گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین تو کجا وہ دین داری کے مراسم سے بھی نابلد ہو گئے۔ چنانچہ میری آنکھ ایک ایسے ماحول میں کھلی جہاں دین اپنی بگڑی ہوئی شکل میں بھی موجود نہیں تھا۔ اس کے بعد ہم لوگ پاکستان آ گئے۔ جس وقت میری والدہ کا انتقال ہوا، میری عمر دس برس تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد مجھے فارسی شاعری کا شوق ہوا۔ فارسی ادب خاص طور پر شاعری کے مطالعے سے آدمی کو دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ اس کے احوال میں ترفع پیدا ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کے اندر فہم کی دیگر سطحوں کا مذاق پیدا ہوتا ہے۔ دراصل میں بچپن ہی سے ایک ذہنی آدمی ہوں۔ میری تربیت ایک مناسب علمی ماحول میں ہوئی اور بڑے مسائل کی طرف کشش مجھے بچپن ہی سے تھی۔ اس نعمت کے میسر آنے کے ساتھ ساتھ ایک اور خوش قسمتی میرے ساتھ یہ ہوئی کہ اتفاقاً میری ملاقات کراچی کی ایک مشہور شخصیت مولانا محمد ایوب دہلوی سے ہوئی۔ ان کی زندگی صحابہ کی زندگی کی مثل تھی۔ حکیم سعید اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے بڑے لوگ ان کے معتقدین میں شامل تھے۔

میری نظر میں، وہ ایک مکمل انسان تھے۔ میں نے ان کا یہ تاثر دینی احساس سے قائم نہیں کیا تھا۔ میرے سامنے دینی شخصیات کی عظمت کے کوئی پیمانے موجود ہی نہیں تھے۔ میں نے محض ایک رومانوی انداز میں انھیں آئیڈیل سمجھا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ بالکل عام آدمی کی طرح رہتے تھے۔ یعنی عالمانہ بات بھی عام لہجے میں کرتے۔ ہاں البتہ جب گفتگو کرنے بیٹھتے تو بدل جاتے اور بالکل عالم لگتے ورنہ عام حالات میں، ابے ابے اور یار یار کر کے بات کرتے۔ ان کی شخصیت کا یہی سحر مجھے ان کی مجالس میں لے جاتا۔ مجھے ان کی علمی گفتگوؤں کا ایک لفظ

بھی سمجھ میں نہ آتا اور پھر میرے میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن میں یہ جان چکا تھا کہ ان کی علمی فضیلت اور شخصی وقار کا اعتراف بڑی بڑی شخصیتوں نے کیا ہے۔ اس پس منظر میں لاشعوری طور پر میرے ذہن میں زندگی کی ایک دینی معنویت اور انسانیت کا ایک عملی معیار تشکیل پانے لگا۔ یوں دین سے میرا تعارف لفظ سے نہیں بلکہ شخص کے ذریعے سے ہوا اور میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ کیونکہ لفظ کے بجائے شخص، مفہوم کے بجائے احساس اور ذہن کے بجائے طبیعت میں جو چیز اترتی ہے وہ زیادہ گہری اور زیادہ اثر انگیز ہوتی ہے۔"

طالب صاحب نے دوسرا سوال کیا: "آپ کو تصوف کی طرف کس چیز نے راغب کیا؟"

"میں نے عرض کیا کہ بڑے مسائل کی طرف کشش مجھے بچپن ہی سے تھی۔ مولانا کا فیض اس میں یہ تھا کہ میں نے ان سے یہ بات سیکھی کہ ذہنی امور طبعی امور کس طرح بنتے ہیں۔ اس دوران میں میرا مطالعہ بھی بڑھتا گیا۔ خاص طور پر فلسفے کی بعض چیزیں میں نے اپنی سطح کے مطابق سیکھ لی تھیں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ الحمدللہ مجھ پر دین کے انکار کا دور کبھی نہیں آیا۔ لیکن ماحول کی وجہ سے میرے ذہن میں بعض سوالات ضرور پیدا ہوئے۔ ان کے حل کے لیے اب مولانا کی شخصیت تو تھی نہیں۔ میں نے خود کوشش کی اور معروف دینی لوگوں سے رجوع کیا لیکن اکثر یہی احساس ہوا کہ وہ اصل مسئلے کو سمجھتے ہی نہیں ....."

اس موقع پر ہم نے معذرت کے ساتھ مداخلت کرتے ہوئے کوئی مثال دینے کی فرمایش کی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے:

"مثال کے طور پر میں نے سوچا، کیا عقل سے غیب کا اثبات محال ہے؟ کانٹ کے مطابق تو مابعد الطبیعیات (Mataphysics) کوئی علم ہی نہیں اور علم صرف وہ ہے جس کی تصدیق عام ہو اور وہ تصدیق پذیر ہو۔ مثلاً یہ میز ہے تو یہ ثابت ہے کہ یہ میز ہے۔ حواس ہی سے اس کا علم حاصل ہوتا ہے اور حواس ہی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اب عقل حواس کی مدد کے بغیر یا دائرۂ محسوسات کے باہر جو تصورات قائم کرتی ہے وہ تکنیکی طور پر تصدیق پذیر یا 'Valid' نہیں ہو سکتے۔ اس وجہ سے تمام مذہبی یا اخلاقی قضایا اپنا ایک اخلاقی تحکم تو رکھتے ہیں لیکن وہ علم نہیں کہلا سکتے۔ یہ کانٹ کا مشہور فلسفہ ہے، جس کو سرِ دست رد نہیں کیا جا سکا۔ اب یہ گھمبیر مسئلہ اور اس میدان میں آنے والے نئے نئے آدمی کا چھوٹا سا ذہن۔ چنانچہ اس مسئلے کو لے کر کئی لوگوں کے پاس گیا اور اس احساس کے ساتھ مایوس لوٹا کہ وہ اس سوال کو سمجھے ہی نہیں۔ اس سے کسی کی توہین مقصود نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ

ہے کہ انھیں اس طرح کے سوالات کا جواب دینا سکھلایا ہی نہیں جاتا۔

وہ کچھ لمحے کے لیے رکے اور طالب صاحب کے سوال کے جواب کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے:

''تو میں کہہ رہا تھا کہ جب مجھے اس طرح کے سوالات کے جواب نہ ملے تو میں نے اللہ سے سمجھوتا کر لیا۔ اور یہ مان لیا کہ آدمی بہت سارے حقائق کو صرف بربنائے عقل ہی تسلیم نہیں کرتا۔ عقل تو محض محسوسات کو پرکھنے کے لیے دی گئی ہے اور جہاں تک دین کو عقل سے پرکھنے والوں کا تعلق ہے تو وہ خود ہی مسائل اور سوال پیدا کرتے ہیں اور پھر خود ہی جواب دے دیتے ہیں۔ اس مقام پر آکر میں نے سوچا کہ اس کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ دین کی ایک مضبوط (Strong) اور زندہ 'Presence' کو 'Face' کیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے دوسرے لوگوں کی تلاش شروع کر دی۔ اب ایسے لوگوں کے بارے میں ہمارے ہاں متداول تصور صوفیہ کا ہے۔ چنانچہ اس طرح میں مجبوراً تصوف کی طرف گیا اور وہاں سے مجھے کچھ ایسے لوگ ملے جنھوں نے اشکال سے پیدا ہونے والے اس خلا کو پر کیا جن کو میں ذہن سے حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر میں اس حقیقت کو جاننے لگا کہ دین کے بارے میں وہ اشکال جو مجھے کسی منفی جہت کی طرف لے جانے کی قابلیت رکھتا ہے وہ خود ہی فطری نہیں۔ یعنی جو چیز دین کی طرف مجھے شک کی طرف لے جا سکتی ہو، وہ خود ہی فطری نہیں۔ یہ اشکالات اور سوالات عقل اور اس کے مقدمات پر اس کی حدود کو جانے بغیر انحصار کرتے ہیں۔ میرے اندر اس طرح کے اشکالات کی ایک غیر فطری کارفرمائی شروع ہو گئی تھی۔ جو الحمد للہ رک گئی۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں لاینحل قسم کے سوالات میں الجھ کر رہ جاتا کیونکہ میں آج بھی کانٹ کے تمام اعتراضات کو لاینحل سمجھتا ہوں اور اس کے کسی سوال کا جواب نہیں لا سکتا۔''

''اس تلاش میں یقیناً آپ کی ملاقات کسی ایسی شخصیت سے ہوئی ہو گی جس کی زندگی دین کا عملی اظہار ہو گی اور جس سے آپ کے اندر کوئی ٹھوس عملی تبدیلی آئی ہو گی؟''

''ایسے کئی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ سبھی غیر معروف تھے۔ ان میں جو قابل ذکر تھے، وہ ایک افغانی تھے۔ ان دنوں میں نوشہرہ میں رہتا تھا۔ ان کے متعلق معلوم ہوا تو میں ان کے پاس گیا۔ وہاں ایک سادہ سا واقعہ میرے ساتھ ہوا اور میں اس واقعے کی آج تک کوئی اطمینان بخش توجیہ نہیں کر سکا۔ جب میں ان سے ملنے گیا تو میں نماز نہیں پڑھتا تھا، جمعہ اور عید کی بھی نہیں۔ اس کے باوجود اپنی دانست میں مسلمان بھی تھا۔ اب میں اپنے ذہن میں یہ طے کر کے آیا تھا کہ ان سے تصوف پر گفتگو کروں گا اور میری نیت سراسر علمی تخریب کاری کی

تھی۔ وہ آزاد قبائلی علاقہ تھا۔ سب لوگ مجھے بڑے مستعد اور متحرک نظر آئے۔ کوئی دیوار بنارہا تھا، کوئی گڑھا کھودرہا تھا، کوئی پانی کا پائپ ٹھیک کر رہا تھا۔ میں پہنچا تو ظہر کی نماز ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں یہ لوگ یہ نہ بھانپ لیں کہ میں نے نماز نہیں پڑھی۔ چنانچہ میں نے وضو کیا اور ایک کونے میں نماز پڑھ ڈالی۔ ظاہر ہے یہ نماز میں نے اپنے دفاع میں پڑھی تھی۔ پھر جب میں ان صاحب کے پاس جانے لگا تو وہ کسی کو قرآنِ مجید کھول کر کچھ بتارہے تھے۔ یہ ساری گفتگو پشتو میں ہو رہی تھی۔ اور پوچھنے والا شخص ان کے سامنے تھا اور یوں میں ان کو دیکھ نہیں رہا تھا۔ جب سائل درمیان سے ہٹا تو میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ ان جیسا خوب صورت آدمی میں نے پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔ روحانی اور ظاہری دونوں طرح سے اور ان سے ملاقات کے بعد بھی ان جیسا شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اس وقت میں ایک 'Trance' میں آگیا (یعنی مسحور ہو گیا) ایسا ہونا میرے تجربے اور طبیعت کے خلاف تھا۔ میں کچھ دیر وہاں پر یونہی بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ مجھ پر ہیبت طاری ہونے لگی۔ اس طرح کا تجربہ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ میں وہاں سے دس پندرہ منٹ بعد اٹھ آیا۔ کوئی سوال نہ کر سکا۔ اس واقعے کے بعد میں نے مہینوں کوئی نماز جماعت کے ساتھ نہیں چھوڑی۔ میں واپس گیا تو راستے میں آنے والی نمازیں مسجدوں میں پڑھتا ہوا گیا اور اس دن سے پہلے مجھے کوئی دن یاد نہیں جب میں نے سورج کو نکلتے دیکھا ہو!''

''اس واقعے کو کتنے برس بیت گئے؟''

''کوئی سترہ اٹھارہ برس۔ اس چیز نے مجھے ایک دم....'' انھوں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور پھر خلا میں گھورتے ہوئے بولے: ''آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایک آدمی کا اتنا اہم اور دیرینہ مسئلہ حل ہو گیا ہو تو اس میں اس شخص کے لیے کس قدر تشکر ہو گا اور اس کے ڈسپلن کے لیے کس قدر احترام ہو گا... پھر میں نے جا کر ان سے بیعت کی۔ بیعت کے بعد ان کی تعلیمات کے ذریعے سے میں ان کے مزید قریب آگیا اور جن مظاہر کو میں نے ان کے ہاں دیکھا ہے، ان کی طرف ایک یکسوئی اور اعتماد پیدا ہو گیا۔''

''تو گویا آپ کشف کو مانتے ہیں؟''

''دراصل صاحبِ کشف ہونا، کشف کو ماننا یا نہ ماننا، اس سے کسی دینی موقف کی تائید یا تردید نہیں ہوتی۔ لیکن کشف کو کوئی اہمیت دیے بغیر، کشف ہونا اور کشف کے وقوع کا تو میں اب بھی قائل ہوں۔''

''یہاں اہمیت سے مراد مذہبی اہمیت ہے؟''

''مذہبی بھی، نفسیاتی بھی اور علمی بھی!'' دراصل یہ ایک نفسیاتی مظہر ہے۔ بعض لوگوں کے ہاں علم بہت

ترقی کر جاتا ہے اور ایسا عام طور پر انھی چیزوں میں ہوتا ہے، جن میں آپ کا اشتغال زیادہ ہو۔ یہ بات ہم سب کے مشاہدے میں ہے کہ کسی بات پر ہم مہینوں سوچتے ہیں لیکن پھر بھی اس کا سرا ہاتھ نہیں آتا، اس کے بعد ہم شعوری طور پر اسے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ مگر پھر چھ مہینوں بعد یکایک بیٹھے بیٹھے وہ مسئلہ اپنے حل کے ساتھ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے اور ایسا ہر آدمی کے ساتھ اپنی اپنی فیلڈ میں ہوتا ہے۔"

"کیا یہ کشف ہے؟"

"بس اس سے ملتا جلتا ہے۔ ماہیت یہی ہوتی ہے۔" انھوں نے مختصر جواب دے کر اپنی بات کے مکمل ہونے کا اشارہ دیا۔

ہم نے موضوع بدل کر سوال کیا: "آپ کی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ عقل کو اس کے عام اور معروف معنوں میں نہیں لیتے، آپ کس چیز کو عقل مانتے ہیں؟"

"مخبرِ صادق کی خبر کو۔ خبر مذہبی معنوں میں۔ اگر آپ کا 'Object' ان شرائط کے ساتھ موجود نہیں ہے جن کے ساتھ ہم موجود ہیں تو اس تک عقل یا خبر کے علاوہ کوئی بھی 'Approach' کامل اور درست نہیں ہو سکتی۔ اس سے میرا علمی یا سمجھنے کا تعلق بھی بر بنائے خبر ہوگا، بر بنائے نظر یعنی عقل یا بر بنائے کشف نہیں ہوگا۔"

"مگر یہ کیسے معلوم ہوگا کہ مخبر صادق کون ہے؟"

"کسی مخبر کا صادق معلوم ہونا بھی ایک خبر ہے، یہ خبر کی دوسری قسم ہے۔ یعنی وسیلے اور ذریعے کے ثقہ (Authentic) یا غیر ثقہ ہونے کی خبر۔ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق مانتے ہیں تو ایسا نہیں کہ ہم نے ان کے تمام افعال اور ان کی تمام اطلاعات کی تصدیق کر لی ہے۔ یہ اس طرح کے منطقی قضایا نہیں ہیں۔ جن کی تصدیق ممکن ہے۔ میں ان معنوں میں انھیں صادق نہیں سمجھتا۔ یعنی یہ صادق کے چھوٹے معنی ہیں۔ دراصل صادق ہونا پوری شخصیت کا ایک عنوان ہے جو بعض ٹھوس تجربات سے لوگوں کے ذہن میں متعین ہوتا ہے اور ان ٹھوس تجربات کی بنیاد پر ایسی شخصیت کے متعلق ایک تصور بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس شخصیت کا ہر ہر جز تجربے میں آنا ضروری نہیں ہے، لیکن میں اس کے ہر جز کو از روے تجربہ تصدیق یا تائید کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہوں۔ ایک صادق وہ ہے جو حقیقی معنوں میں صادق ہے یعنی جس کے اعمال اور اقوال نے اس کے صدق کو مستقل کر دیا اور دوسرا یہ ہے 'Perceived' صادق۔ تو جب اس اصل صادق کا صدق مجھے 'Perceive' ہوا تو میں نے اس پورے صدق کا ایک کل اپنے شعور کا حصہ بنا لیا۔ اس کا کوئی بھی جز اصل

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صادق سے متصادم نہیں ہے لیکن 'Actual' صادق سے متبادل بھی نہیں۔ چنانچہ ایسی صداقت اور ایسا صدق جو خود صدق سے 'Tally' ہونے کے بعد صدق کی پوزیشن حاصل کر لے اس کو مخبرِ صادق کہتے ہیں۔ یعنی خود صدق اپنی 'Validity' کے لیے اس کی تائید، توثیق اور تصدیق کرے۔

''آپ تصوف کسے کہتے ہیں؟''

احمد جاوید صاحب نے پہلو بدلا اور بولے: ''مختصراً میں یہ کہوں گا کہ تصوف کا مقصود تزکیۂ نفس ہے۔ آدمی کی حقیقی افتادِ طبع کو دینی مقاصد کے تابع کرنے کی کوشش کرنا۔ اور یہی تزکیۂ نفس ہے۔ انسان بعض امور میں صرف جزوی وابستگی کی حد تک منسلک ہوتا ہے۔ مگر دین آپ سے مکمل وابستگی کا تقاضا کرتا ہے۔ جب میں لا الٰہ الا اللہ کہہ کر دین میں داخل ہوتا ہوں تو اللہ سے یہ کہتا ہوں کہ میں جیسا کچھ ہوں۔ جتنا کچھ ہوں، اے اللہ آپ کے لیے ہوں اور مجھے جو کچھ بننا ہے، وہ آپ ہی کے تعمیلِ ارشاد میں بننا ہے اسے مکمل وابستگی (Total commitment) کہتے ہیں۔ اب اس مکمل وابستگی میں کچھ احکام یا شرائط ایسی ہوتی ہیں جن پر لفظی طور پر یا زبانی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ وہاں کسی قسم کی لچک پیدا کرنے کی اجازت نہیں۔

لیکن ایک ایسی سطح ہے جس کا مرکز فرد ہے۔ اس میں مکمل وابستگی کے کچھ تقاضے بہر کیف ایسے ہیں جن کی تکمیل کے ذرائع میں مشروط طور پر آزادی اور اختیار کی اجازت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ سے وابستگی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے میرے اندر انفرادی طور پر کچھ موانع اور کچھ معاونات ہیں۔ یاد رہے یہ انفرادی ہیں۔ یعنی یہ ممکن نہیں کہ بنی نوع انسان میں ہر فرد کے اندر اس کی نوعیت یکساں ہو۔ ان معاونات اور موانع کی پہچان پیدا کرنا ایک اہم کام ہے۔ پھر شخصیت کے منفی اور مثبت تمام عناصر کو کسی جائز ذریعے سے اس طرح مجتمع کرنا کہ وہ انسان کو متذکرہ مکمل وابستگی کے سائے میں رکھے۔ دوسرا اہم کام ہے۔ یہ دونوں کام ایک صوفی ہی کر سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کے اندر پائے جانے والے معاونات اور موانع یکساں ہیں، بالبداہت غلط ہے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ایسا کوئی ذریعہ معروضی طور پر (Objectively) نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ اس کی موجودگی انسان کو مجبور بنا دیتی ہے۔''

احمد جاوید صاحب نے اس جواب کے ذریعے سے تصوف پر وارد ہونے والے کئی سوالات کے اجمالاً جواب دینے کی سعی کی تھی مگر ہم نے معاملے کو واضح تر کرنے کے لیے پوچھا:

''کیا اسلام کا مقصد تزکیۂ نفس ہے؟''

انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو ہمارا اگلا سوال تھا: ''کیا کچھ اضافی چیزیں بھی ہیں یا تزکیۂ نفس ہی اصلاً سب کچھ ہے؟''

''دیکھیں، دین مجھ سے جن جن فضائل کا تقاضا کرتا ہے وہ نفس کی مزکّی سطح سے عمل میں آئیں گے اور نفس کی مزکی سطح ہی پر ختم ہوں گے:

''جب یہ ساری چیزیں اسلام کے پیشِ نظر ہیں تو پھر تصوف کے خاص لفظ یا اس کے نام سے ایک خاص مکتبِ فکر بنانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''یہ اصرار محض ایک ضد ہو گی اور تصوف والا اگر اس پر اڑ جائے کہ تصوف عین دین ہے تو یہ ایک غلط رویہ ہو گا۔ ان دنوں کا دفاع شاید کوئی صحیح الدماغ نہ کر سکے۔ جن لوگوں نے تصوف کو دین سے متصادم قرار دیا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دین سے وابستہ رہنے کی جو بھی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ دین نے بیان کر دی ہے اور جو ر کاوٹ ہو سکتی ہے وہ بھی متعین کر کے اس کا علاج بتا دیا گیا ہے۔ بعض جذباتی لوگ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہ ماننے سے دین میں یہ نقص آئے گا کہ دین بطور ہدایت نامکمل ہے۔ لیکن ذہن اس کو نہیں مانتا۔ کیونکہ ہدایت کے حصول کی ہر ہر چیز کی موجودگی اور ہدایت سے روکنے والی چیزوں اور ان کے ازالے کی ہر صورت اگر بیان کر دی جاتی تو انسان اور درخت میں کوئی فرق نہ رہ جاتا اور ایسا ماننے سے انسان کو صاحبِ اختیار قرار دینے کی بھلا کیا دلیل ہو گی؟''

احمد جاوید صاحب نے کچھ لمحوں کا توقف کیا تو ہم نے ان سے اپنی بات کی مزید وضاحت کی درخواست کی۔ وہ گویا ہوئے: ''جب اصولِ ہدایت کے ایک ایک منفی اور مثبت جز کے تعین پر اصرار کیا جائے اور اس کو بھی وحی کے ذریعے سے حاصل کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو پھر انسان کے مکلف ہونے کے کیا معنی ہوئے؟ اور یہ مکلف ہونا انسان کی آزادی اور اللہ کا عطا کردہ اختیار ہی تو ہے۔ اور اختیار یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اٹل حدود و قیود سے تجاوز یا انحراف کیے بغیر اپنے فطری مسائل کا حل نکال سکے۔ اسی اختیار کو بروے کار لا کر دین سے عملی یا علمی وابستگی پیدا کرنے کے لیے تصوف سمیت تمام نظم (Discipline) پیدا ہوئے۔ اب یہ نظم (Discipline) اپنی اپنی تفسیر میں صحیح بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ تصوف میں تزکیۂ نفس اپنی ماہیت میں ایک ایسا ہی مظہر یا عمل ہے۔ اس میں نفس کے تمام محرکات اور مؤثرات کا احاطہ کر کے پاکیزگی کا حصول یعنی اس کی حالت اور نفس میں خرابی کا تعین یعنی اس کی آوارگی کا بیان کافی سے زیادہ ہے۔ اب اس آوارگی کے مختلف اجزا ہیں، ان کا علاج ہے اور اس کے حصول کی تجاویز ہیں۔ یہ انسانی استعداد کی

پیدا کردہ ہیں اور ان پر وہی حکم لگایا جائے گا جو کسی بھی انسان کے فعل یا خیال پر لگایا جا سکتا ہے۔''

''دراصل تصوف پر کیا جانے والا اعتراض، نظم یا 'Discipline' کی جائز حدود کے اندر وسعت پر اعتراض سے یکسر مختلف ہے۔ اس لیے کہ دین میں تزکیہ کا نظم نہیں بلکہ طریقہ بتایا گیا ہے۔ مثلاً نماز اس کے تزکیہ کا ایک طریقہ ہے جبکہ اہلِ تصوف اس سے آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز ایک خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ اذکار بھی ہونے چاہییں۔ اس کی وضاحت آپ کیسے کریں گے؟''

''ایک حوالے سے آپ کا اعتراض درست ہے۔ لیکن تصوف کا بڑا حلقہ، جو صوفیہ کی نمائندگی کرنے کا مستحق ہے، ان کی بہت بڑی اکثریت کا اس سلسلے میں موقف یہ نہیں۔ تقریباً تمام سلاسلِ تصوف میں جن دو اعمال پر زور دیا جاتا ہے وہ نماز اور تلاوتِ قرآنِ مجید اور اس پر تدبر ہے۔ نماز کو اعمال کی فہرست میں رکھ لیں اور سہولت کی خاطر اس کے دو اجزا کر لیں ایک اعمالِ عبودیت اور دوسرے اشغالِ تزکیہ۔ اب اشغالِ تزکیہ انسانی تجربات ہیں۔ ان کا اگر موثر ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے عمل پر اتفاق ہو جاتا ہے۔ اور یہ ان اشغال کے رواج کی وجہ بنتی ہے۔ یہ اشغال ان معنوں میں ہرگز دینی عمل نہیں جن معنوں میں سادہ طور پر ہم انھیں سمجھتے ہیں۔ ان اشغال کا اصل مقصد نماز روزے میں کمال پیدا کرنا ہے۔ اس کمال کی صوفیانہ تعبیر یہ ہے کہ نماز کی صورت بھی مکمل ہے اور حال بھی (اب حال کا مکمل ہونا ایک 'Subjective' چیز ہے)۔ حال کے مکمل ہونے کی نشانی یہ ہے کہ احسان کے دونوں اجزا میں سے کوئی ایک جز میسر ہو، اور اس درجے میں میسر ہو کہ ہم کہہ سکیں کہ ہم نے نماز اس کیفیت میں پڑھی کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا تھا گویا احسان اور حسنِ ادائیگی تصوف کے مقاصد ہیں۔ چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اشغال اختیار کیے جاتے ہیں۔''

''لیکن نماز کے لیے یہ جو چیزیں آپ بیان کر رہے ہیں، اس کا تو دین میں کہیں تذکرہ نہیں...؟''

''دیکھیں۔ کسی نتیجہ خیز گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ ہم آپس میں تھوڑی سی ہم نوائی پیدا کر لیں۔ وہ یہ کہ یہ طے شدہ امر ہے کہ اشغال انسانوں کے ایجاد کردہ ہیں اور ان اشغال کا مقصد یہ ہے کہ نفس میں احوالِ عبودیت کی سمائی کی استعداد پیدا ہو جائے یا بڑھ جائے۔ اب صورت یہ ہے کہ صحابہ یا اس سے متصل دور میں حسنِ معاشرت کی وجہ سے یہ صدقِ حال میسر تھا۔ یعنی صدقِ حال اور صدقِ اعمال میں ہم آہنگی تھی۔ مطلب یہ کہ اندرونی حال، عمل سے متصادم نہیں تھا۔ لیکن جب معاشرے میں بگاڑ آیا تو فرد جس معاشرے سے جو کچھ اپنے نفس کے لیے حاصل کر رہا تھا، اس سے محروم ہو گیا۔ اب اس محرومی کی تلافی کے لیے اشغال کی ضرورت لاحق ہوتی

ہے۔ غلطی یہاں پیدا ہوتی ہے کہ معترض اسے دین سمجھ کر اس کی مخالفت کرتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ خلافِ دین ثابت ہو جائے جبکہ دوسرا اسے عین دین قرار دینے کی آرزو رکھتا ہے۔ میری رائے میں یہ دونوں موقف غلط ہیں۔"

"اصل میں، میری الجھن یہ ہے کہ ہم نے اگر حال کی تکمیل ہی کو اصل مقصد قرار دیا ہے تو اس کے حصول کے لیے آخر اشغال کو ذریعہ کیوں بنایا جاتا ہے، نماز کو کیوں نہیں؟" طالب محسن صاحب کے اس سوال کی تحسین کرتے ہوئے احمد جاوید صاحب گویا ہوئے:

"اصل میں مشکل یہ ہے کہ عملِ مقصود اپنی بہتری کا ذریعہ رکھنے کی نفسیاتی گنجایش نہیں رکھتا۔ مثال کے طور پر مجھے اگر اپنی نماز بہتر کرنی ہے تو بہت سے لوگوں کی نفسیاتی بناوٹ ایسی ہوتی ہے کہ جس عمل میں انھیں کمال اور بہتری مقصود ہے، اس عمل کی تکرار سے انھیں فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ نفسیات (Clinical Psychology) کا اصول ہے کہ جس لفظ کے معنی جاننے ہوں اس کی تکرار نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ معنی جاننے کی صلاحیت کو دیگر الفاظ سے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ بڑی نازک بات ہے اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ میں نماز میں تقاضاے عبودیت پورا نہ کرنے کا نقص مان رہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ نماز ایک ایسا مظہر ہے جس کے ایک سرے پر میں ہوں جس کی اپنی کچھ خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ میں نماز سے مخلص بھی ہوں اور نماز وہ پل ہے جس پر چل کر میں اللہ تک پہنچ سکتا ہوں۔ اب ان سب چیزوں کا اقرار کرنے کے باوجود میں ایک ایسا آدمی ہوں جس کو کچھ ایسے مسائل لاحق ہیں جو اس کی نماز کو اچھا نہیں ہونے دے رہے۔ اب ان مسائل کو حل کرنے کی دو بڑی صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ میں نماز میں زیادہ سے زیادہ وقت لگاؤں یا اس کی مشق اور تکرار کرتا رہوں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھانے کی کچھ ایسی تدابیر اختیار کروں جس سے مجھے یہ احساس ہو کہ میں اس عمل کا 'Active participant' ہوں۔ چنانچہ اشغال اس دوسری صورتِ حال کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ پہلی صورت متقدمین صوفیہ نے اختیار کی ہے۔ وہ اعمالِ عبودیت میں کمال پیدا کرنے کے لیے اسی عمل کی تکرار کرتے تھے جسے وہ مجاہدہ کا نام دیتے تھے۔ اب نماز کی بہتری کی مجھے ذہنی خواہش ہے۔ لیکن اس کے لیے جو کشٹ جھیلنے پڑتے ہیں وہ میں نہیں جھیل سکتا۔ اب وہ آدمی جو نماز کو تکلفاً یا خفیف سا بہتر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وہ اس ارادے کی تکمیل کے لیے مطلوبہ محنت بھی نہیں کرنا چاہتا تو ایسے متاخرین کو یہ مسئلہ پیش آیا اور انھوں نے اشغال کا سہارا لیا۔ اس طرح کی باتوں میں میرا عقیدہ یا نقطۂ نظر یہ ہے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کہ اگر ذرا بھی شبہ پیدا ہو جائے کہ یہ چیز خلافِ سنت یا خلافِ قرآن ہو سکتی ہے تو میں اسے غیر قانونی زبان میں واجب الترک یا واجب التعطل قرار دوں گا۔

اس موقع پر ہم نے ان سے ایک دوسرے پہلو سے سوال پوچھا کہ تزکیۂ نفس کیا ہے؟

بولے: ''اس کی دو سطحیں ہیں۔ ایک آدمی کے نزدیک تزکیۂ نفس یہ ہے کہ وہ اپنے دینی شعور کو اس قدر بلند کرے کہ بلا شرط اور بلا چون وچرا اپنے ارادے کو دین کا تابع کر دے۔ دوسرا آدمی کہتا ہے کہ یا اللہ مجھے ایسا بنا دے کہ میرے داعیاتِ طبیعت شریعت کے تابع ہو جائیں۔ اور میرا پورا طرزِ احساس اور پورا احوالی ڈھانچا شریعت کے تابع ہو جائے۔ میری طبیعت میں کوئی ایسا نقص نہ رہے جو مجھے گناہ پر اکسائے۔ اس سطح کے تزکیۂ نفس کو حاصل کرنے کے لیے تصوف ایجاد کیا گیا۔ یعنی تصوف ایک ضرورت کی پیداوار ہے اور جب یہ بنایا گیا تو ایک بہت بہتر معاشرت میں بنایا گیا۔ اس وقت یہ اپنی ضروریات کی تکمیل اور تعمیل میں اعلیٰ درجے کی قوت رکھتا تھا۔ بعد کے ادوار میں اعتقاداً نہ سہی عملاً ان تدابیر پر ایسا اصرار کیا گیا کہ یہ مقاصد ثانوی حیثیت اختیار کر گئے۔ اب چونکہ ہم تصوف کی اصل (Original) صورت کا دفاع کر رہے ہیں اس لیے بعد کے ادوار زیرِ بحث نہیں۔

ہم اس کی ایک مثال لیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یکسوئی نہیں رہتی۔ اب یکسوئی پیدا کرنے کے لیے کوئی ماہر بتاتا ہے کہ ڈسپرین کھا لیا کرو میں نے ایسا ہی کیا اور مسئلہ قابلِ اطمینان حد تک حل ہو گیا۔ اب اس حل کو دیکھنے کے دو انداز ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ ڈسپرین کھانے کی کوئی دینی معنویت نہیں ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ اعمالِ عبودیت میں جو انتہا ہے اس کو پانے کے لیے اور بندگی کا جو خلاصہ ہے اس کے حصول کے لیے اس نے میری معاونت کی ہے اور میں نے ڈسپرین کو ڈسپرین سمجھ کر کھایا ہے کوئی من و سلویٰ سمجھ کر نہیں کھایا۔ میرے خیال میں ان دونوں رایوں میں کوئی ایسا اختلاف نہیں جس کی بنیاد پر ہم کسی ایک کو دینی حوالے سے غلط یا درست کہہ سکیں۔''

''کیا یہ بدعت نہ ہو گی؟''

''نہیں، بدعت تب ہے جب میں ڈسپرین کو دین سمجھ کر کھاؤں اور اس کی تعلیم و ترغیب اور تاکید کے لیے کام کروں۔''

(جاری)

افسانہ

محمد بلال

چیزیں اور جذبے

میرے بڑے بھائی اپنی فیملی کے ساتھ ایک طویل عرصے سے جدہ میں مقیم ہیں۔ یہ جنوری ۱۹۹۹ء کی بات ہے۔ وہ دو سال کے بعد اپنی فیملی کے ساتھ لاہور آئے۔ ان کا یہ قیام ۲۲ روزہ تھا۔ ان کے لاہور آنے سے ایک عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ ان کی ساڑھے تین سالہ بچی کو لاہور والا گھر پسند نہ آیا۔ وہ ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ چپکی رہتی اور فوری طور پر جدہ واپس جانے کی ضد کرتی رہتی۔ ظاہر ہے یہ ضد پوری نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے اس کی بات کو اہمیت نہ دی گئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جدہ کا گھر لاہور کے گھر سے بہت اچھا ہے۔ بہتر فرنیچر، ائیر کنڈیشنز، کارپٹ، کار، ڈش انٹینا جیسی چیزیں وہاں موجود ہیں، جو یہاں نہیں ہیں۔ پھر جدہ کی صاف ستھری، ہموار اور چوڑی سڑکیں جبکہ لاہور کی سڑکوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اتفاق سے ان دنوں بارش ہو گئی۔ گلیاں اور سڑکیں کیچڑ سے بھر گئیں۔ جس سے صورتِ حال مزید خراب ہو گئی۔ ایک دفعہ میں اپنے اُس بھائی کے کمرے میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بچی حسبِ عادت اپنی ماں کے ساتھ چپکی ہوئی ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کے سامنے اپنے بازو کھولے۔ اسے اپنی گود میں لینا چاہا، لیکن ناگواری کے تاثرات فوراً اس کے چہرے پر ابھر آئے۔ اس نے اپنا منہ جھٹک کر دوسری طرف کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے پوچھا: جدہ اچھا ہے یا پاکستان؟ وہ بغیر کسی توقف کے چیخ کر بولی: جدہ۔

ابھی لاہور میں اس کے دو دن ہی گزرے تھے کہ وہ بیمار ہو گئی۔ اسہال اور قے معمول بن گئے۔ رنگ پیلا ہو گیا۔ چہرہ مرجھا گیا۔ سات آٹھ دن گزر گئے۔ ڈاکٹر سے دوا لینے کے باوجود طبیعت نہ سنبھلی، حتیٰ کہ جسم میں پانی کی کمی ہو گئی۔ ڈاکٹر نے کہا: اسے ڈرپ لگانی پڑے گی۔ اسے ہسپتال داخل کر لیا گیا۔ اس کی دو راتیں ہسپتال میں گزریں۔ ہسپتال میں اسے ملنے اس کے چچا بار بار آتے رہے۔ اس نے رات بارہ بجے کے بعد ایک خاص قسم

کی چپس کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت سردی بہت شدید تھی۔ اتنی رات گئے اور اس سردی میں بھی وہ چپس میں اس کے لیے لے آیا۔ اس کی چچی بھی اسے ملنے آئی۔ اور اس کے کھانے کے لیے کچھ چیزیں گرم کر کے لائی.... اسے رشتوں کے جذبوں کی لذت ملنے لگی.... اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی.... وہ گھر آ گئی۔ وہاں اسے اس کا ماموں ملنے آیا۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنے لگا۔ وہ بھی اس کے ساتھ کھیلنے لگی۔ اس کا کملایا ہوا چہرہ کھلنے لگا.... اس کا چڑچڑاپن کم ہو گیا.... وہ مسکرانے لگی۔ بعض اوقات تو کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔.... اپنی ماں سے دور رہ کر بھی وقت گزارنے لگی۔ اپنی پھوپھیوں اور چچوں کے ساتھ مذاق کرنے لگی۔ میرا کمرا دوسری منزل پر ہے۔ اس کا کمرا نیچے ہے۔ ایک دفعہ وہ اوپر میرے پاس آئی۔ اکیلی۔ مسکراتی ہوئی۔ وہ میرے قریب آئی۔ اس نے میری کمر کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔ اپنا ایک گال میرے ساتھ لگا لیا۔ میں نے پوچھا: جدہ اچھا ہے یا پاکستان؟ وہ بغیر کسی توقف کے ملائمت کے ساتھ بولی: پاکستان۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوچ

ایک دفعہ ایک شخص کو اپنے کھیت میں سے سنگِ مرمر کا ایک خوبصورت مجسمہ ملا۔ وہ اسے کباڑی کے پاس لے گیا۔ جسے تمام نادر اور پرانی چیزیں جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس شخص نے مجسمہ کو فروخت کے لیے پیش کیا۔ کباڑی نے اسے بھاری رقم پر خرید لیا۔ وہ شخص رقم لے کر چلا گیا۔

جب وہ رقم لے کر گھر واپس جا رہا تھا تو اس نے سوچا اور اپنے آپ سے کہا: اس دولت میں کیسی زندگی مضمر ہے اور ایک پتھر کے بے جان مجسمہ کے عوض جو ہزاروں سالوں سے زمین کے نیچے دبا پڑا رہا اور جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ آیا ہو۔ کوئی اتنی بڑی رقم کیسے دے سکتا ہے۔

اب کباڑی اس خوب صورت مجسمے کی طرف دیکھ کر سوچ رہا تھا اور اس نے اپنے آپ سے کہا: کیا زندگی ہے۔ کسی روح کا خواب ہے اور ہزار ہا سال کی میٹھی نیند نے اس میں کیا تازگی بھر دی ہے اور کوئی شخص ایسی خوب صورت چیز کو بے جان اور بے حس دولت کے عوض کیونکر فروخت کر سکتا ہے۔

(کلیاتِ خلیل جبران، ص ۶۴)

خیال و خامہ

جاوید

O

یہ نغمہ دردِ فرقت سے نواے غم ہوا آخر
یہی فرقت کا رشتہ، رشتۂ محکم ہوا آخر

مہ و انجم سے روشن تھا کبھی اپنا یہ میخانہ
وہ اِس کا غلغلہ اب گریۂ پیہم ہوا آخر

یہی آدم و حوا ہے باعثِ تخلیق آدم بھی
یہ افسانہ بھی جزوِ قصۂ آدم ہوا آخر

سنا ہے اب کہیں ابلیس بھی صدیوں کی محنت سے
فرنگی بت گروں کے راز کا محرم ہوا آخر

صدا آئی یہ دینِ حق جب اترا آسمانوں سے
جہاں میں اختلاطِ شعلہ و شبنم ہوا آخر

یہی گھر تھے جہاں کچھ روحِ مشرق دیکھ لیتے تھے
یہ شیرازہ بھی اس تہذیب میں برہم ہوا آخر

اِسی دل سے فروزاں تھے زمین و آسماں لیکن
وہ ظلمت ہے کہ اس کا نور بھی مدھم ہوا آخر

ترے حرفِ عنایت سے میں بے گانہ رہا برسوں
مرے زخمِ جگر پہ اب وہی مرہم ہوا آخر

تعجب ہے زمیں کو، آسماں بھی محوِ حیرت ہے
وہ اک اُمّی تھا، لیکن سرورِ عالم ہوا آخر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com